# طلوعِ اسلام

فروری ۱۹۵۳

-/10/-

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

# طلوعِ اسلام

کراچی

| بدل اشتراک | مرتب | قیمت فی پرچہ |
|---|---|---|
| سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)<br>" غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ | سعید احمد | دس آنے (پاکستانی)<br>بارہ آنے (ہندوستانی) |

| نمبر ۲ | فروری سنہ ۱۹۵۳ء | جلد ۶ |
|---|---|---|

## فہرست مضامین


| | | | |
|---|---|---|---|
| قرآن نے کیا کہا؟ | ۴ | باب المراسلات | ۵۳ - ۶۸ |
| لمعات | ۵ - ۱۴ | ۱ - زکوٰۃ و صدقات | |
| حقایق و غیرہ | ۱۵ - ۱۸ | ۲ - قوموں پر عذاب کی شکلیں | |
| تلاٹھ | | ۳ - والدین کی اطاعت | |
| خدا فریبی یا خود فریبی | | ۴ - کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟ | |
| اسلامی تنظیم | ۱۹ - ۲۵ | ۵ - عورت سے غیر فطری مجامعت | |
| | | نقد و نظر | ۶۹ - ۷۰ |
| یہ کراچی ہے (محترم ہاشمی صاحب) | ۲۶ - ۲۸ | ۱ - خالد | |
| | | ۲ - اقلیم توبہ | |
| سلیم کے نام (محترم پرویز صاحب) | ۲۹ - ۳۹ | ۳ - فرہنگنامۂ جدید | |
| | | رابطۂ باہمی | ۷۱ |
| اقبال کا پاکستان | ۳۰ - ۵۲ | تعبیر نشیمن (نظم) (محترم اسد ملتانی) | ۷۲ |

# قرآن نے کیا کہا؟

(۱) مملکت پاکستان کے اکتیس "علمائے کرام" اکٹھے ہوئے اور ایک مسودہ دستور پاکستان مرتب کیا جس میں انھوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ

مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی

یہ "علمائے کرام" نے کہا۔ اور قرآن نے فرمایا کہ

ولا تکونوا من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً، کل حزب بما لدیھم فرحون۔ (۳۰/۳۱)

(اے مسلمانو! دیکھنا) کہیں مشرک۔ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور فرقے فرقے بن گئے۔ (پھر اس کے بعد حالت یہ ہوگئی کہ ہر گروہ اپنے اپنے مسلک (کو حق سمجھ کر اسی) میں مگن ہے۔

دوسری جگہ رسول اللہؐ سے فرمایا کہ

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شیء۔ (۶/۱۶۰)

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔ تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں۔

غور کیجئے جس فرقہ بندی کو قرآن شرک قرار دیتا ہے ہمارے علمائے کرام اس کا آئینی مطالبہ فرما رہے ہیں۔ اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں، وہ آج سنت رسول اللہؐ کے سب سے بڑے محافظ بن رہے ہیں! کوئی ہے جو ان سے پوچھے کہ تم پاکستان کے دستور کی بنیاد توحید پر رکھنا چاہتے ہو یا شرک پر؟

---

(۲) مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ

امت کا اختلاف رحمت ہے

اور اسے (معاذ اللہ) رسولِ خداؐ کا ارشاد بتاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اختلاف خدا کا عذاب ہے۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینٰت، واولٰئک لھم عذاب عظیم (۳/۱۰۴)

اور دیکھو ان لوگوں کی مانند نہ ہوجانا جنھوں نے فرقے بنالئے اور (کتاب اللہ کی) روشن دلیلیں آچکنے کے بعد اختلاف کرنے لگے۔ یقین کرو۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

سوچئے کہ یہ لوگ جو خود خدا کے عذاب میں مبتلا ہیں، دوسروں کو نجات کی راہ کیا بتائیں گے؟

---

(۳) ہمارے "علمائے کرام" کا مطالبہ ہے کہ ہم سے پوچھو کہ فلاں معاملہ شریعت کے مطابق کیسا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے کہتا ہے کہ

وشاورھم فی الامر (۳/۱۵۸)

معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔

یعنی اللہ اپنے رسول تک سے یہ کہتا ہے کہ معاملات میں امت سے مشورہ کیا کرو۔ اور ہمارے "علمائے کرام" امت سے یہ کہتے ہیں کہ تم، ہم سے پوچھا کرو اور جو کچھ ہم کہیں اس کے مطابق فیصلے کیا کرو! یعنی یہ حضرات اپنا مرتبہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ سے بھی اونچا سمجھتے ہیں۔

---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اسمبلی میں پیش ہوئی تھی اس پر ہمارا تبصرہ جنوری کے پرچہ میں شائع ہو چکا ہے۔ جس میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام تو خیر بہت بڑی چیز ہے آج عام دنیا بھی آئین وسیاست اور ضوابط معاشرہ میں جن بلندیوں تک پہنچ چکی ہے اس رپورٹ کی سفارشات اس سطح تک بھی نہیں پہنچ پائیں۔ کتنا حسرتناک ہے یہ منظر کہ دنیا کے سامنے یہ دعوٰی کرنے والی قوم کہ ہم ایک ایسا آئین پیش کریں گے جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکے گی اپنے آئین کا خاکہ اس قسم کا مرتب کرے۔ یہ منظر حسرتناک تو ضرور ہے لیکن حیرتناک نہیں۔ نئی دہلی میں سکریٹریٹ کی عمارت کے بڑے دروازہ پر ایک عبارت کندہ تھی جس کا ترجمہ یہ ہے:

آزادی کسی قوم تک نیچے اتر کر نہیں پہنچا کرتی۔ قوم کو آزادی تک پہنچنے کے لئے خود بلند ہونا پڑتا ہے۔

اس زمانہ میں یہ خیال آیا کرتا تھا کہ چونکہ سکریٹریٹ کی عمارت اس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی جب ہندوستان میں تحریک آزادی کا زور تھا اور انگریز اس تحریک کی مخالفت کیا کرتے تھے اس لئے یہ عبارت شعوری یا غیر شعوری طور پر اس تحریک کا جواب تھی۔ چنانچہ یہ جواب بڑا طنز آمیز نظر آیا کرتا تھا۔ اب ہم سوچتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ انگریز نے اس عبارت کو خواہ طنزاً ہی کیوں نہ لکھا ہو مگر بات بالکل اصولی اور مبنی بر حقیقت تھی۔ آزادی کو چھونے کیلئے انسانی قامت کی بڑی ضرورت ہے۔ اتنا بلند کہ نٹشے کے الفاظ میں

تجھے اس مقام پر کھڑا ہونا چاہئے جہاں سے تو اپنے مقدرات کے ستاروں کو بھی جھک کر دیکھ لے۔

اگر ہم خود اٹھ کر چاند تک نہیں پہنچتے تو ہمیں صرف چاند کا وہ عکس مل سکتا ہے جو پانی کے کٹورے میں چاندنی کر دکھائی دے رہا ہو لیکن جسے ایک ذرا سی کنکری یا ہوا کا جھکورا پانی میں حل کر دے۔ اب یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن نے صحیح آزادی کے طالبین سے یہ کیوں کہا تھا کہ

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۲۱۴)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم یونہی جنت میں پہنچ جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں وہ حالات پیش ہی نہیں آئے جو ان لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ انھیں اسقدر مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے دل ہل گئے اور رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی؟

اسی لئے قرآن نے اسی جنت کو جنت قرار دیا ہے جو خونِ جگر سے حاصل کی جائے۔

آں بہشتی کہ خدائے تو بخشد ہمہ ہیچ

تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست

انسان کو اُسی دولت کی قدر ہوتی ہے جو اس کی خود پیدا کردہ ہو۔ میراث میں ملی ہوئی دولت کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ رئیس زادوں کے اَللّے تللّے دنیا میں مشہور ہیں۔ انھیں کمانے اور دولت کو بڑھانے کا سلیقہ تو ایک طرف جو کچھ ترکہ میں ملا ہوا ہے سنبھال کر رکھنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ ہمیں پاکستان جیسی دولت نے نہالِ یونہی بیٹھے بٹھائے مل گئی۔ ہم خود جد جہد کو کر آزادی تک نہ پہنچے بلکہ آزادی کو اس کی سطح بلند سے اتار کر ہم تک پہنچا دیا گیا۔ ہماری جنت خونِ جگر کی پیدا کردہ نہیں۔ "آدم" کی جنت ہے جو اسے یونہی مل گئی تھی۔ ہم نے جنت تو لے لی لیکن اس کی ذمہ داریوں کا احساس ہی نہیں کیا۔ حالانکہ خدا نے اپنے رسول تک سے کہدیا تھا کہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۔ تم پر بہت بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑنے والا ہے۔ کیسا بوجھ؟ وِزْرَكَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ ایسا بوجھ جس سے کمر ٹوٹ جائے۔ خدا نے ہمیں یہ مملکت دی تھی تو یہ کہہ کر

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴)

پھر پہلوں کے بعد ہم نے تمہیں حکومت عطا کی تاکہ دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔

ہم نے اس پانچ چھ برس کے عرصہ میں حکومت ملنے کے بعد کیا کچھ کر کے دکھایا اسے تو چھوڑیئے اس آئین سازی کے مسئلے میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس سے ہمیں رہ رہ کر حضرت لوطؑ کی وہ تاسف انگیز پکار یاد آجاتی ہے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ

اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ (۱۱/۷۸)

کیا تمہاری ساری قوم میں ایک خدا کا بندہ بھی ایسا نہیں جو کچھ سمجھ بوجھ سے کام لے؟

یہ تو اربابِ اقتدار کی حالت ہے اور دوسری طرف جو گروہ خیر سے امت کو شریعت کی صراطِ مستقیم پر لیجانے کا دعویدار ہے! اسے دیکھ کر بار بار قرآن کی یہ توبیخ سامنے آجاتی ہے کہ

قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۹/۶۵)

ان سے کہئے کہ کیا تم اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول سے مذاق کرتے ہو؟

گروہ اول کی یہ کیفیت ہے کہ ان کے نزدیک آئین پاکستان میں صرف ایک شق ایسی ہے جس پر غور کرنے اور جس کے لئے کٹ مرنے کی ضرورت ہے اور وہ شق یہ ہے کہ حکومت میں صوبجاتی نمائندگی کی پوزیشن کیا ہونی چاہیے۔ اس مہینہ بھر میں اس مسئلہ کے متعلق ہمارے اربابِ حل و عقد نے جس افسوسناک ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے تصور سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد وغیرہ سے جو آواز اٹھی اس انداز کی کہ گویا پاکستان کے خطۂ زمین میں کچھ ایسی قومیں بس رہی ہیں جن کا ایک دوسرے سے نہ کوئی رشتہ ہے نہ کوئی تعلق۔ اگر رشتہ ہے تو باہمی رقابت کا اور اگر تعلق ہے تو محاربت کا۔ جس طرح

انگوٹھی کا ملمع ذرا سے تاؤ میں اُڑ جاتا ہے اور اس کے نیچے سے اصلی پیتل نکھر کر سامنے آجاتا ہے یہی منظر اس وقت سامنے آیا۔ وہ لوگ جو تحریک پاکستان کے دس سال کے عرصہ میں ہر اسٹیج سے چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ ہماری قومیت کا معیار نسل، زبان، اور جغرافیائی حدود و ثغور نہیں

بنایا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے نرالا

ہماری وجہ جامعیت اور مدار قومیت مذہب ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ ہندوستان کے کسی صوبہ کا باشندہ ہو ایک ہی قوم کا فرد اور ایک ہی کُل کا جزو ہے۔ اب انہیں کی یہ حالت دیکھی کہ ہر صوبہ کے لوگ ایک ایک مستقل قوم بنے بیٹھے ہیں۔ اور جس طرح دنیا کی اور قومیں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی فکر میں رہتی ہیں کچھ اسی قسم کے ان کے تیور ہو گئے۔ اور یہ سارا قصہ کس مقصد کے لئے؟ آنے والے الیکشنوں میں انتخاب لڑنے کے لئے۔ اسمبلیوں میں نشستیں حاصل کرنے کیلئے، ملازمتوں میں حصہ بٹورنے کے لئے۔ ہر ایک کے دل میں چور ہے اور ہر ایک کے سر پر ایک خوف سوار ہے۔ ایک صوبہ والوں کو دوسرے صوبہ والوں پر اعتماد نہیں۔ ایک علاقہ والوں کو دوسرے علاقہ والوں پر بھروسہ نہیں۔ ہم نے پانچ برس تک صوبجاتی تفریق و تمیز کے جو کانٹے بوئے تھے وہ آج بڑے بڑے ببول بن کر ہمارا راستہ گھیرے کھڑے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان بننے کی عام وجہ کیا تھی؟ یعنی اس کی بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنی قرآنی بصیرت سے قوم کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

لیکن جس چیز نے اس خیال کو عام کیا وہ یہ تھا کہ ہم نے اسمبلی کی نشستوں میں مسلمانوں کے جداگانہ تناسب کا مطالبہ کیا اور اسی طرح ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حصہ مخصوص کر دینے کا سوال اٹھایا۔ جب یہ جداگانہ تناسب مقرر ہو گیا تو پھر ملازمت کی ایک ایک آسامی کی تقسیم سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی تاآنکہ ان کی دو جداگانہ حکومتیں بن گئیں۔ جو چیز وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا کی گئی تھی بعینہ وہی چیز یہاں پاکستان کے مختلف صوبوں کے مسلمانوں کے اندر پیدا کر دی گئی اور اسی تفریق کی بنیادوں پر آئین پاکستان کی عمارت استوار کی جا رہی ہے۔ یعنی ہم نے سب سے پہلے اس ملک کے دو الگ الگ نام رکھے — مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان — اور اس سے مشرق اور مغرب کی وہ تفریق جسے مٹانے کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا اور گہری کر دی۔ اس کے بعد ہم نے مختلف صوبوں کے لئے ملازمتوں کا جداگانہ تناسب مقرر کیا اور اس طرح صوبجاتی بعد و مغائرت کی گرہیں اور کس دی گئیں۔ ہم نے ہندوستان میں جداگانہ تناسب کا سوال اس لئے اٹھایا تھا کہ ہمارا دعویٰ یہ تھا مسلمان اور ہندو دو جداگانہ قومیں ہیں اس لئے ان کے جداگانہ حقوق و مفادات کا تحفظ ضروری ہے۔ لیکن یہاں زبان سے ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ تمام مسلمانانِ پاکستان ایک قوم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مختلف صوبوں کا جداگانہ تناسب اسی طرح قائم رکھا جا رہا ہے جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں رکھا گیا تھا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جس عمل نے ہندوستان میں ایک قسم کا نتیجہ پیدا کیا تھا وہی عمل پاکستان میں کسی دوسری قسم کا نتیجہ پیدا کریگا۔؟

حذر! اے چیرہ دستاں !! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

جب ہم اس ذہنیت کے نتائج و عواقب کا تصور کرتے ہیں تو ہماری روح کانپ اٹھتی ہے کہ

مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

بین الاقوامی سیاست اس درجہ نزاکت اختیار کئے جا رہی ہے کہ قوموں کے اندر ذرا سا داخلی اختلاف اور انتشار انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا موجب بن سکتا ہے۔ اس دوڑ میں حالت یہ ہے کہ جو قوم پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے بھی ذرا رکی تو وہ پیچھے سے آنے والوں کے ریلے میں کچل کر رہ جاتی ہے۔ بین الاقوامی بساط سے الگ ہٹ کر دیکھا جائے تو پاکستان میں اس قسم کے مسائل ہماری موت اور حیات کا معیار بنتے جا رہے ہیں جو اس سے پہلے کوئی مسائل ہی نہ تھے مثلاً سرزمین پاکستان میں روٹی کا مسئلہ کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں جاتا تھا کہ اس پر کسی قسم کا غور کیا جائے۔ "بھوک سے کوئی شخص مر نہیں سکتا" ہمارے یہاں کا محاورہ تھا اور واقعات بھی اس کی شہادت دیتے تھے لیکن اب اس پاکستان میں حالت یہ ہے کہ خواص ہوں یا عوام کسی کو روٹی کی فکر سے چھٹکارا نہیں اور مستقبل اور بھی تاریک نظر آ رہا ہے ابھی یہ اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ بارش کے بروقت نہ ہونے سے یا نہروں کے پانی میں رکاوٹ اور دیگر اسباب کے ماتحت نہ تو اتنا رقبہ زیر کاشت آسکا ہے جتنا پہلے آتا تھا اور نہ ہی فصلوں سے پہلے جیسی غلہ کی امید کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے اگلے سال کیلئے غلہ کی امید اور آج یہ حالت ہے کہ خود پنجاب کے بعض علاقوں میں تیس چالیس روپے من گیہوں بک رہا ہے۔ گرانی کا یہ عالم ہے اور اس کے ساتھ بیکاری اور بیروزگاری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ان گوناگوں مشکلات کی وجہ سے ملک کی آبادی کی اکثریت کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ

نہ دام دانم و نے دانہ ایں قدر دانم

زفرق تا بقدم ہر چہ ہست در بند است

مشکلات میں الجھے ہوئے مصائب میں جکڑے ہوئے۔ مصیبتوں میں پھنسے ہوئے عوام کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی کے دن کس طرح کاٹے جائیں۔ نہ ہمارے ہاں اعداد و شمار رکھے جاتے ہیں کہ معلوم ہو سکے کہ ہماری پیداوار کتنی ہے اور زمین کے امکانات پیدائش کس قدر اور نہ ہی یہ کہ ہماری آبادی کس رفتار سے بڑھ رہی ہے اور اس کے پیش نظر ہماری زمین کتنے بوجھ کی متحمل ہو سکتی ہے۔ (MALPHUS) کے بعض نظریات مسترد ہو جانے کے باوجود یہ حقیقت مسلم ہے کہ ہر خطۂ زمین ایک خاص تعداد تک کے رزق کی کفالت کر سکتا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس قانون کی رو سے ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور آئندہ دو چار برس میں ہماری حالت کیا ہونے والی ہے۔ اس قحط سالی و زبوں حالی کے ساتھ ملک کے نظم و نسق کی مشینری میں جو تباہ کن خرابیاں آ چکی ہیں وہ بھی کسی کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ایسے ناسازگار حالات میں امید کی کوئی کرن باقی رہ سکتی تھی تو وہ یہ کہ ملک کی اندرونی وحدت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جائے لیکن ہماری شومئی قسمت کا کیا علاج کہ عین ان حالات کے اندر ملک میں صوبجاتی تفریق کی خلیجیں زیادہ سے زیادہ گہری کی جا رہی ہیں اور ملک کے ارباب حل و عقد کی ساری کوشش اسی میں صرف ہو رہی ہیں کہ ملک کا آئین اس قسم کا بنے جس سے ان خلیجوں کی وسعت اور گہرائی اور بھی زیادہ ہوتی چلی جائے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں ہمارے نزدیک ان مشکلات کا حل صرف یہ ہے کہ

(۱) ملک میں وحدانی نظام حکومت قائم کیا جائے یعنی اس کی صوبائی تقسیم کو ختم کر دیا جائے۔ ملک کا ایک مرکز ہو، ایک ہی مجلس مقننہ ہو صرف انتظامی مقاصد کیلئے ملک کو مختلف قطعات میں بانٹ دیا جائے اور مرکز کے قوانین اور فیصلے ان تمام قطعات ملک میں یکساں طور پر نافذ ہوں۔ جب صوبجات ختم ہو جائیں گے تو صوبجاتی تناسب اور نمائندگی کا سوال بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہی ہماری مشکلات کا حل ہے اور یہی قرآنی تعلیم کا منشاء۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا  نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

(۲) ملک کے تمام وسائلِ پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی تحویل میں دیدیا جائے تاکہ رزق کی تقسیم افراد کی ضروریات کے مطابق ہو۔ اور وہ توانائیاں جو اس وقت محض روٹی کے پیچھے مارے مارے پھرنے میں ضائع ہو رہی ہیں ملت کی بہبود اور اسلام کا نام بلند کرنے کے مقصد عظیم میں صرف ہوں۔ جو قوم اپنی زندگی کے ضابطہ کو الحمد للہ رب العلمین کے بنیادی اصول سے شروع کرتی ہے وہ اسی صورت میں قابل حمد و ستائش ہو سکتی ہے جب وہ ربوبیت عامہ کا فریضہ سرانجام دے۔ یہی قرآن کا پیغام ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس  نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس

---

یہ تو ہوا فساد فی البر کے متعلق، اب فساد فی البحر کی طرف آئیے یعنی اس خطہ کی طرف جہاں خشکی کی جگہ دلدل ہی دلدل ہے اور اس کے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوا کرتی۔ وما ھم بخارجین من النار۔ یہ طبقہ ہے ہمارے "علمائے کرام" کا۔

جب تک حکومت کی طرف سے دستوری سفارشات مرتب نہیں ہوئی تھیں انھوں نے شور مچا رکھا تھا کہ دستور پاکستان ۱۹۵۲ء کے اندر اندر مرتب ہو جانا چاہئے لیکن جب یہ سفارشات مرتب ہو کر باہر آئیں تو انھوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ان پر سوچ بچار کرنے کے لئے وقت بہت تھوڑا دیا گیا ہے۔ حکومت نے پہلے تو اس میعاد میں تھوڑی تھوڑی توسیع کی اور اس کے بعد اب اس مسئلہ کو غیر متعین عرصہ کے لئے التوا میں ڈالدیا۔ اس طرح ان حضرات کے دونوں تقاضے پورے ہو گئے۔ سفارشات ۱۹۵۲ء میں مرتب بھی ہو گئیں اور ان پر غور و فکر کرنے کیلئے وقت بھی مل گیا۔

ان سفارشات پر شرعی نقطۂ خیال سے غور کرنے کے لئے اُنہی علماء کا (جو جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں اکٹھے ہوئے تھے) پھر کراچی ہی میں اجتماع ہوا۔ ان کا تبصرہ اور ترمیمات منظر عام پر آچکی ہیں۔

سب سے پہلے تمہید میں لکھا ہے کہ یہ اجتماع "تمام اسلامی فرقوں اور گروہوں کے معتمد علیہ علماء" کا تھا۔ معلوم نہیں کہ ان علماء کو معتمد علیہ ہونے کا سرٹیفکٹ کہاں سے مل گیا۔ حالانکہ اس فہرست میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جنھوں نے نہ کسی مذہبی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے اور نہ ہی جن کا نام بحیثیت عالم کے اس سے پہلے کبھی کسی نے سنا ہے۔ عوام کا معتمد علیہ ہونا تو ایک طرف ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کا کسی جماعت سے بھی تعلق نہیں اور جن کا بعض جماعتوں سے تعلق ہے ان کے متعلق بھی یہ معلوم نہیں کہ انھیں ان کی جماعت نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ لیکن جب انسان اپنے متعلق آپ ہی کچھ لکھنے کیلئے بیٹھے تو وہ جو جی میں آئے لکھ لے۔

کمیٹی کی سفارش تھی کہ شراب، جوئے اور عصمت فروشی کا انسداد کیا جائے۔ مولوی صاحبان نے شراب کی جگہ مسکرات تجویز کیا ہے اور یہ بھی

کہا ہے کہ ان فواحش کو زیادہ سے زیادہ تین سال کے اندر بند کر دیا جائے۔ اس ترمیم میں "منکرات" کی تفصیل نہیں دی گئی۔ غالباً اسلئے کہ اس تفصیل پر خود ان علماء حضرات کا بھی اتفاق نہیں ہوگا۔ مثلاً ان کے ہاں تمباکو نوشی کے متعلق بھی متفقہ فیصلہ نہیں مل سکے گا۔

پھر یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ کمیٹی کی سفارش کا منشاء تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان فواحش کو دستور کی تاریخ نفاذ کے ساتھ ہی بند کر دیا جائے لیکن ہمارے "علماء کرام" اس کے لئے تین سال کی مزید چھٹی دیتے ہیں۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ (مثلاً) جوئے کو ایک دن میں بند کر دینے سے کونسی چیز مانع ہو سکتی ہے۔؟

اب آئیے اس نقطہ کی طرف جو ہمارے نزدیک سب سے اہم ہے (جو شن مولوی صاحبان کے نزدیک سب سے اہم ہے اس کا ذکر آگے آئیگا) یہ حضرات ہر جگہ شور مچا رہے تھے کہ ہم نے جو دستوری خاکہ پیش کیا ہے وہ تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ ہم نے بار بار کہا کہ یہ محض فریب ہے مولویوں کے مختلف فرقے ایک بات پر جمع ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ چیز صرف قرآن سے ممکن ہے۔ لیکن یہ لوگ قرآن کے عملاً منکر ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین کا مدار روایات پر ہے (جسے یہ حضرات عوام کو دھوکا دینے کے لئے سنت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں) اور روایات کی رو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے متفق ہو جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے قرآنی دستور پاکستان صفحات ۱۶۲—۱۶۵) چنانچہ اب ان کے اس ادّعا کی قلعی کھل گئی اور بات وہی نکلی جو ہم کہتے تھے۔ شروع جنوری میں لاہور میں پاکستان شیعہ کانفرنس اور مجلس جعفریہ پاکستان کے مشترکہ اجلاس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا جس میں کہا گیا کہ

> مجوزہ دستور اساسی میں اس امر کی توضیح کر دی جائے کہ کتاب و سنت کا مفہوم وہی ہوگا جو شیعوں کے نزدیک مستند اور مسلّم ہو۔ (اخبار انجام $4\frac{1}{53}$)

اس کے بعد کراچی میں شیعہ کونشن منعقد ہوئی اور اس میں بھی اسی مطالبہ کو دہرایا گیا ہے۔ اب ان مولوی صاحبان کی سفارشات میں جو ترمیم پیش کی گئی ہے اس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ

> کوئی قانون جو مسلمانوں کے شخصی معاملات سے متعلق ہو ہر فرقہ کے لئے کتاب و سنت کے اس مفہوم کی روشنی میں بنایا جائے گا جو اس کے نزدیک مستند ہو۔ اور کوئی فرقہ دوسرے فرقہ کی تعبیر کا پابند نہ ہوگا۔ نہ کوئی ایسا قانون بنایا جائیگا جس سے کسی فرقہ کے مراسم و فرائض مذہبی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔

سب سے پہلے شخصی معاملات اور غیر شخصی معاملات کی تفریق پر غور کیجئے۔ قرآن کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے اس میں آپ کو کوئی حرف بھی اس قسم کا نہ ملے گا جس سے مترشح ہوتا ہو کہ دین کے احکام میں شخصی اور غیر شخصی معاملات میں تفریق ہو سکتی ہے۔ دین نام ہے اس ضابطۂ حیات کا جس میں انسان اور کائنات، انسان اور انسان، اور انسان کی داخلی کشمکش کے متعلق رہنمائی دی جاتی ہے۔ کسی فرد کو کسی صورت میں بھی ان تین الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ مادیت کی سائنس اور دین میں فرق ہی یہ ہے کہ یہ سائنس انسان کے مختلف حصوں کا الگ الگ مطالعہ کرتی ہے اور دین انسان کو تماماً دیکھتا ہے۔ جب دور اول کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آئی تو مذہب اور سیاست کی وہ ثنویت پھر سے پیدا ہو گئی جسے مٹانے کیلئے قرآن آیا تھا۔ اس ثنویت کا تقاضا تھا کہ انسانی معاملات کو دو حصوں میں

تقسیم کر دیا جائے۔ ایک شخصی معاملات اور دوسرے اجتماعی معاملات۔ مذہب کا تعلق شخصی معاملات سے ہو اور اجتماعی معاملات سیاست کے ماتحت رہیں۔ چنانچہ مولوی شخصی معاملات کا ذمہ دار بن گیا اور حکومت اجتماعی امور کی۔ جب انگریز ہندوستان میں آیا تو یہاں شخصی اور اجتماعی امور کی یہی غیر اسلامی تفریق موجود تھی۔ چونکہ اس نے اعلان کیا کہ حکومت مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کریگی اس لئے اس نے شخصی معاملات کے لئے "پرسنل لاء" بنا دیا، جسے اصطلاح میں "محمڈن لاء" یا قانونِ شریعت کہا جاتا تھا۔

یہ ہے تاریخ شخصی معاملات اور اجتماعی امور کی غیر اسلامی تفریق کی۔ اب ہمارے یہ معتمد علیہ علمائے کرام جمع ہوتے ہیں تاکہ پاکستان کا دستور اسلامی منشاء کے مطابق مرتب کیا جائے اور اس میں سفارش یہ فرماتے ہیں کہ شخصی معاملات کے متعلق یوں ہو اور اجتماعی معاملات کے متعلق یوں۔ آپ سوچئے کہ اس سے بدتر غیر اسلامی ذہنیت کا مظاہرہ بھی کہیں ہو سکتا ہے؟ ہم ان صفحات پر بار بار اپنے خون آلود آنسوؤں سے لکھ چکے ہیں کہ ان علمائے کرام کا مذہب عجمی سازشوں کا پیدا کردہ ہے جو اسلامی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے عمل میں لایا گیا اور اس نے اسلامی اصطلاحات کے پردہ میں عہدِ جاہلیہ کے عقائد و تصورات کو مسلمانوں کے رگ و پے میں جاری و ساری کر دیا۔ یہ حضرات اس عجمی اسلام کے محافظ اور صحیح اسلام کے مزار کے متولی ہیں۔ اس کا ثبوت آپ کے سامنے ہے کہ ان کے نزدیک شخصی معاملات کے لئے الگ قانون ہونا چاہئے اور اجتماعی معاملات کے لئے الگ۔ اس یکسر غیر اسلامی اصول کے تابع ہر فرقہ کا شخصی قانون الگ ہوگا۔ یہ سب فرقے اپنے قانون کو اسلام بتائیں گے اور اس اسلام کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی سند بھی حاصل ہوگی۔ سوچئے کہ اسلام کا ان لوگوں سے بڑا دشمن کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟

اس سفارش میں دوسری چیز وہی ہے جسے ہم اس سے پیشتر بصد جگر فگاری و سینہ ریشی ان صفحات پر بیان کر چکے ہیں یعنی "مسلمہ اسلامی فرقوں کا وجود" ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ پھر سن لیجئے کہ اسلام میں فرقوں کا وجود بہ نصِ صریح شرک ہے۔ قرآن صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ (۳۰/۳۲)

مسلمانو! دیکھنا تم شرک نہ بن جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک فرقہ بن گئے۔

وہ رسول اللہ سے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۰۷)

جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن گئے تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں۔

ہم ان "علمائے کرام" کی پوری کی پوری جماعت کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن کی رو سے فرقوں کا وجود کسی طرح بھی اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے؟ قرآن کی ان نصوصِ صریحہ کی روشنی میں "اسلامی فرقوں" کے وجود کے لئے آئینی سند اور مملکتی تحفظ کی سفارش کرنا اگر کفر اور شرک کی ترویج نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ سب چیزیں عجمی سازش کی پیدا کردہ ہیں اور روایات کے سہارے پر قائم ہیں۔ مولوی اس مشرکانہ تحزب و تشیع کو محض اسلئے قائم رکھنا چاہتا ہے کہ اس کے مٹنے سے اس کی اپنی ہستی مٹ جاتی ہے۔

کہا جاسکتا ہے (اور مولوی اس کے لئے عام طور پر یہی دلیل پیش کرتا ہے) کہ جب یہ فرقے بہرحال موجود ہیں تو اس کا علاج کیا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ ان کا وجود اسلام کے نزدیک جائز ہے یا ناجائز۔ اگر جائز ہے تو پھر یہ کہنا کہ چونکہ یہ موجود ہیں اسلئے انھیں باقی رکھنا چاہیئے بہت بڑی جہالت ہے۔ مثال کے طور پر سمجھئے کہ اسوقت پاکستان میں شرابیوں کا گروہ موجود ہے، قمار بازوں کا گروہ موجود ہے، عصمت فروشوں کا گروہ موجود ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اسلام کی رو سے ان گروہوں کا وجود ناجائز ہے تو آپ نے فوراً سفارش کردی کہ ان گروہوں کو قانوناً مٹا دینا چاہیئے۔ مٹا دینے سے یہ مراد نہیں کہ انھیں سنکھیا دیکر ہلاک کر دینا چاہیئے بلکہ یہ کہ جو چیزیں ان گروہوں کے وجود کا سبب ہیں ان چیزوں کے وجود کو ختم کر دیا جائے۔ یہی ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ مسلمانوں کے الگ الگ فرقے اسلام کی رو سے ناجائز ہیں تو جو چیزیں ان فرقوں کے وجود کا باعث ہیں انھیں مٹا دینا اسلامی مملکت کا اولین فریضہ ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ مسئلہ ایسی شکل اختیار کر چکا ہے جس کا کوئی حل ممکن نہیں لیکن آپ سوچئے کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟ آپ ایک طرف ساری دنیا کو یہ کہتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اسلام میں موجود ہے اور دوسری طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ خود ہمارے اپنے ہاں ایک ایسی مشکل ہے جس کا حل اسلام میں موجود نہیں۔ آپ غور کیجئے کہ آپ اسلام کے متعلق کیا اعلان کر رہے ہیں۔ اگر اسلام خود مسلمانوں کے مسائل کا حل دینے سے بھی قاصر ہے تو یہ دوسروں کے مسائل کا حل کیا دیگا۔ ایسے اسلام کے متعلق تو ہر شخص ہنسکر کہدیگا کہ

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری ❊ بخدا کہ لازم آید ز تو احتراز کردن

لیکن اس باب میں مولوی بے چارہ واقعی معذور ہے۔ اس کے اسلام میں اس مشکل کا حل واقعی نہیں ہے اسلئے کہ یہ مشکل خود اس کے اسلام کی پیدا کردہ ہے اس کا حل قرآن میں ہے اور قرآن کے قریب مولوی آنا نہیں چاہتا۔ یہ ہے اس کی وہ معذوری جسے وہ اس نقاب میں پیش کرتا ہے کہ اس مشکل کا حل اسلام میں موجود نہیں ہے۔ ہم ان علمائے کرام سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس مشکل کا علاج قرآن کے بس کی بات ہے یا نہیں؟ اگر (معاذ اللہ) نہیں ہے تو وہ اس کا کھلے کھلے الفاظ میں اعلان کیوں نہیں کرتے اور اگر اس کا حل قرآن میں موجود ہے تو وہ اسے اختیار کیوں نہیں کرتے؟ ملا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اصل مبحث سے گریز کرکے اسی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے کہ طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث، منکرِ رسالت، منکرِ سنت اور نہ جانے کیا کیا قرار دیدیا جائے تاکہ لوگ ملا کو صحیح بات کا جواب دینے پر مجبور کرنے کے بجائے طلوعِ اسلام کے پیچھے پڑ جائیں۔ یاد رکھئے طلوعِ اسلام اس اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے جسے خدا نے نازل کیا، جسے اس کے رسولؐ نے نافذ کیا۔ اور جسے صحابہ کبارؓ نے قبول کیا اور جس میں فرقہ بندی شرک ہے۔ وہ اسلام آج بھی رائج کیا جاسکتا ہے مگر اس کے لئے بڑی جرأت و ہمت اور قربانی کی ضرورت ہے۔

---

طلوعِ اسلام پہلے دن سے کہتا چلا آرہا ہے کہ قرآن کی رو سے افراد مملکت کی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی مملکت کے ذمہ ہوتی ہے اس سے قبل آپ نے یہ بات کسی مولوی سے نہیں سُنی ہوگی۔ ان علمائے کرام نے ۱۹۵۱ء میں یہ سفارش کی تھی کہ مملکت ایسے لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری وغیرہ کی وجہ سے سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔ طلوعِ اسلام نے

لکھا تھا کہ مملکت کی یہ ذمہ داری تمام افراد مملکت کو محیط ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اب ان علمائے کرام نے طلوع اسلام کی اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم الشان ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جبکہ وسائل پیداوار خود اس کی تحویل میں ہوں۔ مگر مولوی میں ابھی اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ کو اپنے سے ناراض کر لے جبکہ اسی کے سہارے آجتک اس کی روٹی قائم ہے لہذا اس باب میں ان "علماء" نے یہ سفارش کی ہے کہ

مملکت کی معاشی پالیسی اسلام کے اصول عدل عمرانی پر مبنی ہونی چاہیئے۔

یہاں کچھ نہیں بتایا گیا کہ اسلام کے عدل عمرانی کا تقاضا کیا ہے۔ آئین کے معاملہ میں بات صاف صاف کرنی چاہیئے اس گونگو سے کیا حاصل!!

ایک سفارش میں یہ کہا گیا ہے کہ

مملکت کیلئے لازم ہے کہ وہ جغرافیائی قبائلی، نسلی اور لسانی اور اسی قسم کے دوسرے غیر اسلامی جذبات دور کرے۔

یعنی جغرافیائی قبائلی وغیرہ غیر اسلامی تفرقات کو تو دور کرے اور مذہبی تفرقات کو اور مستحکم کرے۔ یہ ہے مولوی کا اسلام۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اسوقت سب سے اہم مسئلہ جس سے پاکستان کی سالمیت اور وحدت خطرہ میں ہے صوبائی اختلافات ہیں غالباً آپ متوقع ہوں گے کہ "علماء حضرات" اس باب میں شریعت کی راہنمائی سے قوم کو مستفید فرمائیں گے۔ لیکن ایک ایسے مسئلہ میں جس پر اظہار رائے سے کسی نہ کسی صوبہ کے ارباب اقتدار کی ناراضگی کا خطرہ ہو علمائے کرام کیوں اظہار رائے کریں چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

اس باب میں ایوان ولایات اور ایوان جمہور کی ترتیب و تشکیل جس طرح کی گئی ہے اس میں متعدد امور ایسے ہیں جو اس مجلس کے نزدیک سخت قابل اعتراض ہیں اور ان میں بڑی بے اصولی بھی پائی جاتی ہے مگر چونکہ اس وقت مختلف صوبوں کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان ان امور میں گفت و شنید ہو رہی ہے اور ہم اس میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتے اسلئے ان کے بارہ میں ہم سردست اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔

کیسا صحیح ہے یہ فیصلہ۔ ایسے اختلافی امور میں واقعی کوئی شریعت کا مسئلہ بیان نہیں کرنا چاہیئے۔ مصلحت کا یہی تقاضہ ہے سیاسی راہنماؤں میں جسقدر اختلافات بڑھیں انہیں بڑھنے دینا چاہیئے بلکہ ان کے بڑھنے میں مدد دینی چاہیئے کیونکہ (معاذ اللہ) "اختلاف امتی رحمۃ" آپ حضرات کے نزدیک ارشاد نبوی بھی ہے۔ اور مُلا کی روٹی بھی اسی اختلاف سے وابستہ ہے اسلئے اس میں تو دین اور دنیا دونوں کا فائدہ ہے۔

اسی طرح زبان کے مسئلہ میں بھی یہ لوگ بالکل صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ ہو کر رہ گئے ہیں۔ قائداعظم مرحوم کی زندگی میں جب حالات اردو کیلئے سازگار تھے تو یہ حضرات اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے اردو کی حمایت میں نعرے لگایا کرتے تھے۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو خود مشرقی بنگال سے علماء کا ایک خاص وفد اردو کی حمایت میں لاکھوں بنگالیوں کے دستخط لیکر آیا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے چونکہ بنگال میں اردو اور بنگلہ کا سوال ایک سیاسی اختلاف کی صورت اختیار کر چکا ہے اسلئے اس قسم کے اختلافی مسائل میں ملا اپنی زبان کب کھول سکتا ہے۔ قوم کی وحدت و سالمیت پارہ پارہ ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ ملا کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ صم بکم عمی بنا ہوا ایک کونہ میں بیٹھا رہے۔ قوم کی بدقسمتی ہے کہ مذہبی امامت و قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جنہیں اظہار حق کی جرأت کبھی نہیں ہوئی۔

اب لیجئے وہ شق جو "مولوی صاحبان" کے نزدیک سب سے اہم ہے۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ سر مجلس مقننہ کے ساتھ علماء کی ایک ایک

کمیٹی متعین کردی جائے جو یہ بتائے کہ فلاں معاملہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کمیٹی کی سفارشات میں یہی وہ سفارش ہے جو ان کے سیاسی تدبر پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مولویوں کی نبض کو کیا خوب پہچانا ہے۔ "مولوی صاحبان" اس سفارش سے بہت خوش نظر آتے ہیں لیکن ترمیم یہ پیش کرتے ہیں کہ ان علماء کا منصب سپریم کورٹ کے ججوں کے برابر رکھا جائے اور ان کیلئے "جملہ ضوابط" (یعنی تنخواہ وغیرہ) وہی ہوں جو دوسرے ججوں کیلئے تجویز کئے جائیں۔ ہم اس معاملہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ یہ روٹی کا مسئلہ ہے اور دوسروں کے رزق میں لات مارنا اچھا نہیں۔

جہاں تک علماء کی مجلس کا تعلق ہے ہم اپنی سابقہ اشاعت میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ یہ تصور اس (THEOCRACY) سے مستعار لیا گیا ہے جسے مٹانے کیلئے قرآن آیا تھا اور جو انسان کے عہد جاہلیت کی یادگار ہے۔ اسلام کا دامن ان دھبوں سے بالکل پاک ہے: آپ دیکھ چکے ہیں کہ خود علماء کا یہ بورڈ مشاورتی حیثیت سے بھی کس قدر قابل اعتراض ہے چہ جائیکہ اسے سپریم کورٹ کے ججوں کی حیثیت دیکر مجلس قانون سازی کو ناکارہ کردیا جائے۔ علاوہ اس کے کہ یہ خود اس جمہوریت کے خلاف ہے جس کا شور مچایا جارہا ہے خود اسلامی نقطۂ نظر سے بھی ناقابل قبول ہے۔ قرآن نے وشاورھم فی الامر۔ اور وامرھم شوریٰ بینھم کا حکم دیکر یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ امیر ملت ضروری مسائل کا فیصلہ پوری ملت کے مشورہ سے کریگا نہ کہ کسی خاص گروہ کے مشورہ سے جس کی صورت یہی ممکن ہے کہ پوری ملت کے منتخب نمائندے اس کو مشورہ دیں۔ قرآن کریم نے مرکز ملت کو مولویوں کی کسی خاص جماعت سے مشورہ کا کہیں پابند نہیں کیا بلکہ یہ حق پوری ملت کا قرار دیا ہے۔ پھر یہ اس قرارداد مقاصد کے بھی خلاف ہے جس کے سہارے مولوی صاحبان یہاں تک پہنچے ہیں۔ قرارداد مقاصد میں بھی (sovereignty) عوام کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے نہ کہ مُلاؤں کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی تاریخ پر چونکہ ہماری نظر ہے اس لئے ہم ملت کو متنبہ کردینا چاہتے ہیں کہ یہ ایسی شرمناک قسم کی تھیاکریسی ہوگی جس کی نظیر ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملے گی۔ یہی ملا تھے جنھوں نے ماضی میں مسلمانوں کی حکومتوں کو برباد کیا تھا۔ اگر اب پھر ان کے ہاتھوں میں اقتدار سونپ دیا گیا تو پاکستان کا حشر افغانستان و ایران سے بدتر ہوکر رہے گا۔

علماء حضرات کے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اس مقصد کیلئے "عالم" کسے قرار دیا جائے۔ ہم خود منتظر تھے کہ دیکھیں وہ اس گتھی کو کس طرح سلجھاتے ہیں۔ اسلئے کہ ہم سمجھتے تھے کہ ایک عالم کیلئے کم از کم اتنی شرط تو ضرور رکھنی پڑیگی کہ وہ کسی مستند دینی درسگاہ کا سند یافتہ ہو۔ لیکن اس شرط کے تحت خود بہت سے وہ حضرات باہر نکل جاتے تھے جو بزعم خویش مقتدر علماء بنے بیٹھے تھے حتیٰ کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بھی۔ جن کی پیہم کوششیں معاملہ کو اس حد تک کھینچکر لائی ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے اس مقصد کیلئے ایسی شرائط رکھی ہیں جن میں سند وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی چنانچہ ایک شرط یہ ہے کہ جو شخص کسی علاقہ میں کم از کم دس سال تک مرجع فتویٰ رہا ہو وہ بھی عالم کہلا سکتا ہے۔ اس شرط سے مودودی صاحب نے اپنا تحفظ کرلیا ہے۔

---

یہ ہیں "مولوی صاحبان" کی سفارشات کے بنیادی خط و خال۔ وہ تھے ارباب دانش (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) اور یہ ہیں ارباب شریعت۔ ان دونوں کے افکار و نظریات کا مطالعہ کیجئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ کس قدر صحیح کہا گیا ہے کہنے والا کہ

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی　　　یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی !!

آنے والا مؤرخ ہماری زبان سے ہمارے متعلق کہے گا کہ قدرت نے ہمیں کیسا زریں موقعہ دیا تھا کہ ہم قرآنی مشعل کی تابناک روشنی میں اقوام عالم کی امامت کا فریضہ سرانجام دیں اور ہم کس بری طرح سے اس موقعہ کو ہاتھ سے کھو رہے ہیں۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ۔ (۱۷۶)

ہم اسے آسمان کی بلندیوں پر لیجانا چاہتے تھے اور یہ کمبخت زمین کی پستیوں کے ساتھ ہی چپک کر رہ گیا۔

مہر و ماہ و مشتری کو ہمعناں سمجھا تھا میں　　　کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا

# حقایق و عبر

**مُلّا ہُڈ**

جب کسی سے یہ کہا جائے کہ اسلام میں پریسٹ ہڈ (ملائیت) نہیں ہے تو اس سے مُلّا کو بیحد غصہ آجاتا ہے۔ اس کا یہ غصہ ہے بھی قابل فہم اس لئے کہ پریسٹ ہڈ ختم ہوجانے سے خود مُلّا ختم ہوجاتا ہے اور اپنی ہستی کو قائم رکھنے کا جذبہ انسان اور حیوان سب کے اندر جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ تقاضا ایسا بنیادی ہے کہ اور تو اور ابلیس نے بھی خدا سے کہدیا تھا کہ مجھے قیامت تک کے لئے زندہ رکھا جائے۔ اس لئے ملا اسے کس طرح آسانی سے برداشت کرسکتا ہے کہ اسلام میں پریسٹ ہڈ باقی نہ رہے۔ وہ تو سارا زور اس میں لگا دے گا کہ اسلام باقی رہے یا نہ رہے پریسٹ ہڈ ضرور باقی رہے۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ ملا کی اسی کوشش زبوں حاصل کی داستان ہے۔ چونکہ ہمارے زمانہ میں یہ خیال روز افزوں عام ہورہا ہے کہ اسلام میں پریسٹ ہڈ کی گنجائش نہیں اور مسلمانوں کی تباہی کا باعث مُلّا ہے۔ اس لئے ملّا نے بھی اپنی مدافعت کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ پاکستان میں ملائیت کے منظم ادارے کے سرخیل سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی خاص جرنلسٹ ٹیکنیک کے ذریعہ ملاازم کے جواز کی دلیلیں بہم پہنچانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اگلے دنوں کراچی کی بار ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع میں تقریر کی جو ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ وہ اپنی تقریر کے دوران میں فرماتے ہیں:-

> حال ہی میں یہ ایک نرالا انداز فکر پیدا ہوا ہے کہ اسلام میں پریسٹ ہڈ نہیں ہے۔ قرآن اور سنت اور شریعت پر کوئی مُلّا کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو۔ جس طرح وہ تعبیری احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ہم بھی یہی حق رکھتے ہیں . . . . . . اگر جہالت کی اس طغیانی کو یوں بڑھنے دیا گیا تو بعید نہیں کہ کل کوئی اٹھ کر کہے کہ اسلام میں "وکیل ہڈ" نہیں ہے اس لئے ہر شخص قانون پر بولے گا چاہے اس نے قانون کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو۔ اور پرسوں کوئی دوسرے صاحب اٹھیں اور فرمائیں کہ اسلام میں انجنیر ہڈ نہیں ہے اس لئے ہم بھی انجنیرنگ پر کلام کریں گے چاہے ہم اس فن کی الف بے سے بھی واقف نہ ہوں اور پھر کوئی تیسرے صاحب اسلام میں ڈاکٹر ہڈ کا انکار کرکے مریضوں کا علاج کرنے کھڑے ہوجائیں بغیر اس کے کہ ان کو علم طب کی ہوا بھی لگی ہو۔

آپ غور کیجئے کہ مودودی صاحب نے ایک غلط تشبیہ کو کس طرح دلیل بنا کر پیش کردیا ہے اور اس کے بعد خوش ہوگئے ہیں کہ ہم نے

اسلام میں پرسیٹ ہڈ کا وجود ثابت کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وکالت ڈاکٹری اور انجنیری فنی پیشے ہیں اور ان کے لئے ان خاص فنون کا علم ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دین بھی اسی قسم کی فنی چیز ہے جس کے لئے خاص قسم کی ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ دین کی وہ کونسی ٹیکنیکل تعلیم تھی جسے صحابہ کرامؓ نے حاصل کیا تھا جس کے بعد وہ دین کے معاملہ میں بات کرنے کے قابل ہوگئے تھے۔ کیا انھوں نے ان اٹھارہ فنی علوم میں سے کسی ایک کی بھی تحصیل کی تھی جو آج ہمارے دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اور جن کی تحصیل کے بعد اس طالب علم کو "عالم" بننے کی سند عطا ہوتی ہے۔ کیا قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی یہ لکھا ہے کہ جب تک یہ اٹھارہ علوم نہ پڑھے جائیں گے قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کو فن بنانے کے لئے ملانے خود ہی یہ اٹھارہ علوم وضع کئے اور اس کے بعد اس کا اعلان کر دیا کہ ان علوم کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ دین کے متعلق یہ بنیادی تصور ہی باطل ہے اس لئے اس غلط بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت بنا ءعلی الفاسد ہے۔ جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے قرآن کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ولقد یسرنا القرآن للذکر کہ ہم نے ہدایت و رہنمائی کے لئے قرآن کو آسان بنا دیا ہے لیکن ملّا کا یہ کہنا ہے کہ اللہ میاں (معاذ اللہ) غلط کہتے ہیں، قرآن بہت مشکل ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے ان اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے۔ جو انسان کو دین اور دنیا دونوں میں ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ دین انسانی زندگی کے روزمرہ کے معاملات سے بحث کرتا ہے اور روزمرہ کے معاملات فنی علوم کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہ حکم دیا کہ ان معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ یہ مشورہ ان لوگوں سے لیا کرو جن کی پیٹھ پر ان اٹھارہ علوم کی کتابوں کے پشتارے لدے ہوئے ہوں۔ قرآن نے مشاورت کے لئے کوئی حدود نہیں کھینچیں۔ اسے ملت کے لئے عام کر دیا۔ لیکن ملّانے اسے ان "علماء" تک محدود کر دیا جو ان اٹھارہ علوم کے حامل ہوں۔ اسی کا نام پرسیٹ ہڈ ہے اس کی نہ اسلام میں گنجائش ہے اور نہ ہی عقل و فکر رکھنے والی قوم کو ضرورت۔ قوم کی پارلیمان (مجلس مشاورت) ملت کے عام نمائندوں پر مشتمل ہوگی نہ کہ ٹیکنیکل علوم کے ماہرین پر۔ یہی مسلک قرآن نے تجویز کیا تھا اور اسی کو دنیا کی باقی قوموں نے بھی اختیار کر رکھا ہے۔ یہ ہے فرق دین میں اور ڈاکٹری اور انجنیری میں۔ ڈاکٹر اور انجنیر کی مثال کو دین پر منطبق کرنا وہ منطقی التباس ہے جو آج کل کی جرنلزم کا خاص فن سمجھا جاتا ہے۔

پرسیٹ ہڈ کی اجارہ داری کی اس سے بھی زیادہ تنگ شکل یہ ہے کہ ان لوگوں نے دین کی (Authority) کو ایک خاص وضع قطع کے ساتھ مشروط قرار دے رکھا ہے، ان کے نزدیک ایک خاص وضع و قطع رکھنے والا اس قابل ہو جاتا ہے کہ اسے علماء کے زمرہ میں شامل کر لیا جائے خواہ اس نے ان کے کسی دینی مدرسے سے ان علوم کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ ہی کی ہو۔ لیکن جو اس قسم کی وضع قطع نہ رکھتا ہو وہ خواہ اٹھارہ علوم چھوڑ چھتیس علوم کا عالم بھی کیوں نہ ہو علماء کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ ایک دفعہ ایک ملّا ٹائپ نے علامہ اقبالؒ کے متعلق کہا تھا کہ آپ انھیں اسکالر تو کہہ سکتے ہیں عالم نہیں کہہ سکتے یہی وہ ضرورت تھی جس کے ماتحت خود مودودی صاحب کو بھی یہ خاص وضع اختیار کرنی پڑی۔ اس سے پہلے وہ مسٹر تھے لیکن اس کے بعد وہ مولانا ہوگئے حالانکہ کسی دینی درسگاہ کی سند نہ ان کے پاس پہلے تھی نہ اس کے بعد حاصل کی۔ آپ نے خیال فرمایا کہ وہ مسٹر سے مولانا کیسے ہوگئے۔ صرف وضع

قطع کی تبدیلی ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر وکیل اور جج بن سکتا ہے اور ہر شخص انجینرنگ پڑھ کر انجینر اور طب پڑھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے اسی طرح ہر شخص قرآن اور سنت کے علم پر وقت اور محنت صرف کرکے مسائل شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا آج سارے پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مولویوں جیسی وضع قطع نہ رکھتا ہو لیکن اس نے وقت اور محنت صرف کرکے قرآن اور سنت کا علم حاصل کر رکھا ہو۔ اگر کوئی ایسا شخص ہے تو ہم دوسرا سوال یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے آج تک دستور سازی کے سلسلہ میں جسقدر اجتماعات کئے ہیں کیا ان میں کسی ایسے مسٹر کو بھی دعوت دی ہے؟ آپ نے اندازہ لگایا کہ ان حضرات کے نزدیک شریعت کا علم ان اٹھارہ علوم میں ہی محصور نہیں اس کیلئے ایک خاص وضع قطع کی بھی شرط ہے۔ یہی وہ پریسٹ ہڈ کی ذہنیت ہے جس کے خلاف آج علم اور عقل اس طرح احتجاج کر رہے ہیں اور جس احتجاج کو سن کر ملا کے منہ میں جھاگ آجاتے ہیں۔ اگر مودودی صاحب خود اس ذہنیت کا تماشا دیکھنا چاہیں تو ذرا اپنی ڈاڑھی منڈا دیں اور پھر دیکھیں کہ یہ اکتیس علماء جو اس وقت انھیں اس طرح سر آنکھوں پر اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہیں (حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس دینی علوم کی کوئی سند بھی نہیں ہے) اپنے کسی مشورہ میں انھیں عالم کی حیثیت سے شریک ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ آپ وکیلوں ڈاکٹروں اور انجنیروں میں ڈاڑھی والے بھی دیکھیں گے اور ڈاڑھی منڈے بھی۔ لیکن مولویوں کی صف میں کبھی کوئی ڈاڑھی منڈا نظر نہیں آئیگا اور ڈاڑھی والے سے وہ پوچھیں گے بھی نہیں کہ تم نے کسی دینی درسگاہ میں باضابطہ تعلیم بھی پائی ہے؟

خود ان اکتیس علماء کی فہرست کو اٹھا کر دیکھئے جنھوں نے کراچی میں اسلامی دستور کا خاکہ مرتب فرمایا تھا اور جو آجکل دستور سے متعلق تنقیدی بحث کے لئے پھر کراچی میں جمع ہیں کئی لوگ ایسے ہیں جن کے پاس کسی دینی درسگاہ کی باضابطہ سند نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ دین میں (Authority) کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اس فہرست میں کسی ایک ڈاڑھی منڈے کا بھی نام نہیں ہے۔ یہ ہے پریسٹ ہڈ!

---

## خدا فریبی یا خود فریبی

پچھلے دنوں شیخ محمد اقبال ایم۔ اے کی طرف سے "جماعت اسلامی پر ایک نظر" ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے متعلق ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۵۲ء میں لکھا ہے کہ

آج جبکہ دستوری جد و جہد پورا پورا زور پکڑ چکی ہے اچانک بڑی محنت سے لکھی ہوئی یا لکھوائی ہوئی ایک کتاب پبلک کے سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب بڑے اونچے اشاعتی معیاروں کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور جدید طبقہ خصوصاً سرکاری افسروں، ایڈیٹروں اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں میں بلا قیمت تقسیم کی جارہی ہے۔ ایک صاحب کو تو خود ایک مرکزی وزیر صاحب نے بنفس نفیس اپنے دست مبارک سے ہدیۃً پیش کی ہے۔ اس کتاب کا منشاء بجز اس کے کچھ نہیں کہ جماعت اسلامی کے خلاف جہاں مختلف بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا غبار اڑایا جائے وہاں اس پر ملائیت کا ٹھپہ لگا کر جدید عنصر

> کو تعصب میں مبتلا کر دیا جائے۔ . . . . . . . . ظاہر بات ہے کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کوئی معشوق ہونا چاہیئے۔ ہم اس معشوق کو پہلے سے جانتے تھے مگر وہ اس روز پوری طرح کھل کر عوام کے سامنے آگیا جس روز ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے پشاور کے اسلامیہ کالج میں تقریر کرتے ہوئے پورے زعم اقتدار کے ساتھ فرمایا کہ ہم ملا کو برسرِ اقتدار آنے نہیں دیں گے۔

ہم نہ تو شیخ محمد اقبال صاحب سے واقف ہیں اور نہ ہی ہمیں اس کا علم ہے کہ یہ کتاب انہی کی لکھی ہوئی ہے یا کسی اور کی لیکن سوال یہ نہیں کہ کتاب کس کی لکھی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ کتاب میں لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر وہ صحیح ہے تو کتاب خواہ گمنام ہی کیوں نہ شائع ہو اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ غلط ہے تو اس کے مصنف کی تصویر بھی ساتھ ہی کیوں نہ شائع ہو پھر بھی اس قابل کہ اسے اٹھا کر پھینک دیا جائے۔ ترجمان القرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ اس کتاب میں فلاں فلاں بات غلط ہے۔ بس اتنا کہہ کر کہ یہ کتاب فرضی نام سے شائع ہوئی ہے فضا میں یہ اثر پیدا کرنا چاہا ہے کہ جماعت اسلامی کے خلاف اتہامات لگائے جاتے ہیں اور غلط پروپیگنڈے سے اسے بدنام کیا جاتا ہے۔ یہ خود پروپیگنڈے کی ایک ٹیکنیک ہے کہ لوگوں کی توجہ اصل بات سے ہٹا کر اس طرح دوسری طرف منعطف کرادی جائے کہ وہ پروپیگنڈا کرنے والے کو بے گناہ اور مظلوم سمجھنے لگ جائیں اور فریق مقابل کو ظالم اور بے ایمان۔ جماعت اسلامی کی یہ ٹیکنیک صرف اسی کتاب کے متعلق نہیں وہ عام طور پر کرتے ہی یہ ہیں۔ جب ان سے کوئی پوچھے کہ آپ کے خلاف فلاں شخص نے یہ بات کہی ہے تو وہ اول تو یہ کہدیں گے ہم ایسے ذلیل لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہتے اسلئے ہم اس کا کوئی جواب نہیں دینگے۔ اور اگر کہیں مجبور ہو جائیں تو یہ کہہ دیں گے کہ لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ہماری تحریروں کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں وہ اس کے بعد یہ کبھی نہیں لکھیں گے کہ ہماری اصلی تحریر یہ تھی اور اسے پیش یوں کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں اسے خدا فریبی کہا جائے یا خود فریبی۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں مرزائیوں کی طرح جماعت اسلامی نے بھی اپنے ہاں یہ ذہنیت پیدا کردی ہے کہ وہ علم، تقویٰ، اصول پرستی، دیانت داری سب کچھ اپنے ہاں محصور سمجھتے ہیں اور اپنے سے باہر ساری دنیا کو چور، بے ایمان، بددیانت اور منافق قرار دیتے ہیں۔ خود اسی کتاب کے ضمن میں دیکھیئے اگر ان کے پاس اس امر کا کوئی ایسا ثبوت موجود ہے (جسے شہادت کہا جاسکے) کہ شیخ محمد اقبال ایک فرضی نام ہے اور اس کتاب کے اصلی مصنف ڈاکٹر محمود حسین صاحب یا کوئی اور صاحب ہیں اور یہ حکومت کی طرف سے شائع ہوئی ہے تو انھیں چاہیئے کہ اس ثبوت کو لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ دنیا حقیقت سے واقف ہو جائے اور اگر ان کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تو محض ظن اور قیاس کی بناء پر دوسروں کو بدنام کرتے پھرنا اور اپنے آپ کو بڑا سچا اور اصول پرست ظاہر کرنا صالحین کا شیوہ تو نہیں ہو سکتا۔ جو جماعت اپنے نام کے ساتھ اسلامی لکھتی ہے کم از کم اسے اسلام کی ایسی ابتدائی باتوں کا تو پابند ہونا چاہیئے۔

اس کے باوجود ہم ترجمان القرآن کے شکر گذار ہیں کہ اس نے ڈاکٹر محمود حسین صاحب کا نام لیکر طلوع اسلام کو مزید سب و شتم سے بچا لیا ورنہ ان کے حلقہ بگوش تو یہی مشہور کرتے پھر رہے تھے کہ یہ کارنامہ بھی طلوع اسلام ہی کا ہے۔

# اسلامی تنظیم

اِس وقت دنیا کے نظامِ سیاست پر مغربی تصورات پورے طور پر چھائے ہوئے ہیں۔ اکثر قومیں تو ایسی ہیں جہاں مغربی اقوام کا مرتب کردہ نظام اپنی جزئیات سمیت، نافذ ہے۔ لیکن جو قومیں اس کا دعویٰ کرتی ہیں کہ ہم اپنا نظام خود وضع کرتے ہیں، ان کی بھی یہ حالت ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے آئین و دستور مغربی نظام ہی کا عکس ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی اصطلاحات میں فرق ہو لیکن بنیادی تصورات اِن کے ہاں بھی وہی کارفرما ہوتے ہیں۔ جس زمانے میں دنیا کے مختلف ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے آمد و رفت کا سلسلہ ایسا عام نہ تھا۔ وسائل رسل و رسائل اور اسباب و ذرائع مراسلات، قریب قریب مفقود تھے۔ اس وقت تو یہ صورت ممکن تھی کہ کسی ایک خطۂ زمین کی تہذیب اور کسی ایک قوم کے تصورات، دوسری اقوام پر اثر انداز نہ ہوں۔ لیکن آج جبکہ ساری دنیا ایک بستی بن چکی ہے، یہ ناممکن ہے کہ اقوامِ غالب کے نظریات و تصورات، دوسری قوموں کے اذہان و قلوب پر اپنا اثر نہ ڈالیں۔ یہ وجہ ہے کہ جو اقوام اپنے آئین و دساتیر آپ وضع کرنے کی مدعی ہیں، ان کی بساطِ سیاست بھی مغربی مہرہ بازوں کی نقل و حرکت کا عکس بن جاتی ہے۔

آج دنیا میں جمہوریت (ڈیموکریسی) کا چرچا عام ہے۔ جمہوریت سے مراد لی جاتی ہے "لوگوں کی اپنی حکومت" یہ سیاسی تصور (جو انقلاب فرانس کے بعد عام ہوا) بڑا خوش آئند ہے لیکن اس کے لئے جو مشینری وضع کی گئی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام محکوم کے محکوم ہی رہتے ہیں اور اوپر کے طبقے کے چند افراد، حکومت کرتے ہیں۔ رُو سو نے "عوام کی مرضی" (WILL OF THE PEOPLE) کو اصل حاکم قرار دیا تھا۔ لیکن جب یہ سوال پیدا ہوا کہ "عوام کی مرضی" معلوم کس طرح کی جائے، تو یہاں سینکڑوں الجھاؤ شروع ہو گئے جن سے نکلنے کے لئے اس نے اس قدر دماغ سوزی کی تھی۔ آخر الامر "عوام کی مرضی" معلوم کرنے کا ذریعہ قرار پائے وہ الیکشن جن سے عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ کیا ان الیکشنوں کے ذریعے فی الواقعہ حکومت عوام کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس طریق کار سے، عوام محکوم کے محکوم ہی رہتے ہیں اور ان کے وہی نمائندے جو ان کی مرضی کے اظہار کا ذریعہ بنے تھے ان کے حاکم بن جاتے ہیں۔ اگر ہم اُن الیکشنوں سے قطع نظر بھی کرلیں جو برسرِ اقتدار پارٹی کی دھاندلی کا مرقع ہوتے ہیں اور جن میں "انتخاب" عوام کی ووٹوں سے نہیں بلکہ پولیس کے ڈنڈے سے ہوتا ہے۔ اور ان ممالک کے الیکشنوں کو لے لیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں اظہارِ رائے میں عوام پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔ (حالانکہ یہ دعویٰ بھی قطعاً غلط ہوتا ہے۔ وہاں اگر پولیس کے ڈنڈے کا جسمانی استبداد نہیں ہوتا تو پراپیگنڈہ کا وہ نفسیاتی استبداد موجود ہوتا ہے جو عوام کے

ذہن کو یکسر ماؤف کردیتا ہے۔ اپنی مرضی نہ یہاں ہوتی ہے نہ وہاں۔ بہرحال اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہاں ووٹ کسی دباؤ سے حاصل نہیں کئے جاتے۔) تو بھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس طریق کار سے "عوام کی حکومت" کبھی قائم نہیں ہوتی۔ ان الیکشنوں میں ہوتا کیا ہے؟ ملک کو مختلف حلقوں (CONSTITUENCIES) میں بانٹ دیا جاتا ہے اور ہر حلقہ سے ایک ایک نمائندہ منتخب ہو کر آجاتا ہے۔ اس ممبر کا تعلق اپنے رائے دہندگان سے اس وقت تک تو رہتا ہے جب تک وہ منتخب نہیں ہوتا۔ لیکن جس وقت وہ منتخب ہو جاتا ہے تو پھر اس کی رائے اپنی رائے ہوتی ہے اور اس کی مرضی اپنی مرضی۔ عوام کی رائے یا عوام کی مرضی کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ منتخب ہو جانے کے بعد یہی نمائندہ اپنے رائے دہندگان کا سچ مچ کا افسر بن جاتا ہے۔ وہ جدھر سے گذرتا ہے لوگ اٹھ اٹھ کر اسے سلام کرتے ہیں۔ ہر وقت اس کی خوشامدیں ہوتی رہتی ہیں۔ لوگ اس سے خائف رہتے ہیں کہ نہ معلوم وہ کس قسم کا نقصان پہنچا دے۔ اسلئے کہ اب اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ عوام کے نزدیک (جن کا وہ نمائندہ ہے) اسی کا نام "گورنمنٹ" (یا سرکار) ہوتا ہے۔ اس طرح یہ بیچارے ڈرتے سہمتے وقت گذارتے ہیں تاآنکہ نیا الیکشن آجاتا ہے۔ ان چار دنوں کے لئے البتہ یہ منظر سامنے آجاتا ہے کہ عوام بھی کچھ اپنی حیثیت رکھتے ہیں (بشرطیکہ ان کی یہ حیثیت پھر پولیس کے ڈنڈے کی نذر نہ ہو جائے)۔ اس کے بعد پھر وہی محکومی کی محکومی رہ جاتی ہے۔ اور اگر اتفاق سے وہ پارٹی برسر اقتدار آجائے جس کے خلاف کسی نے ووٹ دیا تھا تو پھر پوچھئے نہیں کہ الیکشن کے بعد اس کی کیا درگت بنتی ہے۔

جمہوریت کی موجودہ مشینری کا ہر جگہ یہی نتیجہ ہے۔ حکومت عوام کے نام سے کی جاتی ہے لیکن درحقیقت عوام، محکوم کے محکوم رہتے ہیں۔ ایوانِ حکومت میں نہ کوئی ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، نہ ان کے احساسات کی نمائندگی۔ نہ کسی کو ان کی مصیبتوں کا احساس ہوتا ہے نہ ان کی مشکلات کا اندازہ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جیسا کہ (Y. R. SIMON) نے اپنی کتاب (PHILOSOPHY OF DEMOCRATIC GOVERNMENT) میں لکھا ہے، جب تک ممبر خود اس طبقے میں سے نہ ہو جس کا وہ نمائندہ ہے، وہ ان کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کر نہیں سکتا۔ اس کیلئے ان کی مشکلات و مصائب کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ جس کے میز پر صبح شام دس دس قسم کے کھانے آجائیں، اسے کیا معلوم کہ لوگوں کو "لائن لگا کر" ڈپو سے آٹا لینے میں کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں۔ جس کے کھانے میں بہترین قسم کی ڈبل روٹی کے ٹوسٹ آجاتے ہوں وہ کیا جانے کہ "لکڑی کا برادہ" کھانے سے کیا کیا امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جس کے ناشتے میں بٹیر اور تیتر کا تازہ گوشت موجود ہو اسے کیا معلوم کہ لوگوں کو کس قسم کا گوشت کھانے کو ملتا ہے۔ جس کے کتوں پر ہزار ہزار روپیہ ماہوار خرچ آجاتا ہو اسے کیا خبر کہ ایک کلرک ساٹھ روپیہ ماہوار پر اپنے بیوی بچوں سمیت کس طرح گذارا کرتا ہے۔ جس کے گھوڑوں کے لئے عالیشان اصطبل موجود ہوں وہ کیا جانے کہ ٹاٹ کی جھونپڑی میں رہنے والوں کے بچوں پر دسمبر کی راتوں میں کیا گذرتی ہے؟

جو نہیں آشنا مصیبت کا    درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا    جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے
اسے معلوم کیا خدا کیا ہے

اُدھر نمائندے کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے رائے دہندگان کے احساسات و مشکلات سے واقف نہیں ہوتا۔ اُدھر رائے دہندگان کی یہ مشکل ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات ارباب حل و عقد تک پہنچا ہی نہیں سکتے۔ ان کے پاس اس کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ خود اپنے نمائندے کے خلاف شکایات لئے لئے پھرتے ہیں اور ان کی نہ کہیں رسائی ہوتی ہے نہ شنوائی۔ لیکن اس کے باوجود اس جمہوریت کا دعویٰ یہ ہے کہ حکومت درحقیقت انہی عوام کی ہے (جو اس طرح دربدر مارے مارے پھرتے ہیں اور جن کی کہیں داد فریاد نہیں ہوتی)۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کا جمہوری نظام حکمران طبقہ کی طرف سے ایک فریب ہے جو ان عوام کو دیا گیا جنھوں نے ان کی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ فریب بڑا کامیاب رہا۔ یہ "فریب" اس وقت ان تمام ممالک میں عام ہو رہا ہے جہاں مغرب کا جمہوری اندازِ حکومت کارفرما ہے۔

---

دنیا کو صحیح جمہوریت کا تصور سب سے پہلے قرآن نے دیا۔ اس نے کہا کہ "تمکن فی الارض" (اقتدار) پوری کی پوری ملت کو ملتا ہے اس کے کسی خاص طبقہ کو نہیں۔ "شھداء علی الناس" ساری کی ساری امت کو بنایا جاتا ہے، اس کے کسی خاص گروہ کو نہیں۔ "امر بالمعروف ونھی عن المنکر" (نفاذِ قانون) کا فریضہ پوری کی پوری جماعت کا ہے، خاص افراد کا نہیں۔ اس لئے کوئی نظامِ مملکت جس میں تمام کے تمام افرادِ ملت برابر کے شریک نہ ہوں، قرآنی نقطۂ نگاہ سے جمہوری نہیں کہلا سکتا۔

قرآن نے جہاں یہ اصول بتایا اس کے ساتھ ہی وہ مشینری بھی وضع کر دی جو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنے۔ اس کا تعلق نظامِ صلوٰۃ سے ہے۔ ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہماری نگاہوں کے سامنے وہ گروہ بھی ہے جس کے لبوں پر (صلوٰۃ کا نام سن کر) خفیف سی ہنسی ابھر گئی ہے اور وہ طبقہ بھی جس کی پیشانی پر شکن پڑ گئے ہیں اور منہ میں جھاگ آگئی ہے۔ اول الذکر گروہ ہے ہمارے جدید تعلیم یافتہ کا جن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ نظامِ حکومت اور جمہوریت کی مشینری کے ساتھ صلوٰۃ کا کیا تعلق؟ اور دوسرا گروہ ہے ہمارے علما حضرات کا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ نماز کو نظامِ حکومت کی مشینری سے تعبیر کرنا الحاد و بیدینی ہے۔ بھلا عبادت کو حکومت سے کیا تعلق؟ حقیقت یہ ہے کہ اول الذکر گروہ کی استہزا کی ہنسی کا اصل سبب بھی یہ دوسرا گروہ ہے جس نے صدیوں سے یہ تصور پیدا کر رکھا ہے کہ نماز، خدا کی پرستش ہے۔ اسے زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں۔ مسجد خدا کی بندگی (یعنی پوجا پاٹ) کی جگہ ہے۔ اس میں دنیا کی باتیں کرنا سخت گناہ ہے۔ حتیٰ کہ نظریں اونچی کر کے اس کی چھت کی طرف دیکھنا، بارگاہِ خداوندی میں گستاخی ہے۔ خدا کے سامنے سر جھکائے، نظریں نیچی کئے کھڑے رہنا چاہئے۔ چپ چاپ، خاموش۔ ایسے پر عظمت اور قابلِ تعظیم مقام میں دنیاوی باتیں کیسے روا رکھی جا سکتی ہیں! لیکن انھیں کون بتائے کہ اسلام میں نہ دنیا کی باتیں دین سے الگ ہوتی ہیں اور نہ ہی "عبادت" سے مفہوم پرستش یا پوجا پاٹ ہے۔ یہاں دنیا کی تمام باتیں جو قانونِ خداوندی کے مطابق طے کی جائیں عینِ دین ہوتی ہیں اور ہر وہ کام جو ضابطۂ الٰہی کے مطابق کیا جائے عبادت بن جاتا ہے۔ دین کا یہی تصور ہے جس میں نظامِ صلوٰۃ اُس جمہوریت کی تشکیل کا ذریعہ بن جاتا ہے جو ضابطۂ خداوندی کے مطابق متشکل ہوتی ہے۔

اسلامی جمہوریت ایک دائرہ ہے جو تمام ملت کو محیط ہوتا ہے۔ اس دائرہ کا مرکز وہ مرکزی جماعت ہوتی ہے جو مملکت کے نظم و نسق کی آخری ذمہ دار ہوتی ہے جس طرح دائرے کے محیط کا ہر نقطہ مرکز سے یکساں فاصلہ پر ( EQUI- DISTANT) ہوتا ہے اسی طرح اسلامی جمہوریت میں ملت کا ہر فرد، مرکز ملت سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے اور ہر فرد کی آواز اس مرکز تک بلا تکلف پہنچ جاتی ہے۔ اس کے نظام کی ابتدا نیچے سے (یعنی افرادِ ملت سے) ہوتی ہے اور اوپر چڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ یہ اس مرکز تک پہنچ جاتی ہے جو اس نظام کی آخری کڑی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شہر کو لیجئے۔ اس شہر کو چھوٹے چھوٹے قطعوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جنہیں محلہ کہہ لیجئے۔ قرآن کی رُو سے ضروری (فرض) ہے کہ ہر محلے کے افرادِ ملت ایک وقت مقررہ پر ایک مقام پر جمع ہوں۔ (اسی لئے صلوٰۃ کو "کتاباً موقوتاً" یعنی مؤقت فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ ایسا اجتماع جو وقتِ معین پر ہوگا) اس میں کسی کی استثنا نہیں۔ اس اجتماع میں ہر ایک کی شرکت لازمی ہے۔ ایک محلہ میں ایک ہی اجتماع ہوگا۔ قرآن نے اس مسجد کو جس سے افرادِ ملت میں تفریق پیدا ہو جائے جہنم قرار دیا ہے۔ اور ان لوگوں کی جائے پناہ جو خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ کئے ہوں۔ قرآن نے ملت کے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ اس لئے افرادِ ملت میں نہ مذہبی فرقوں کی کوئی گنجائش ہے نہ سیاسی پارٹیوں کی۔ ملت ایک ہے اور تمام افراد اس ایک کُل کے اجزا ہیں۔ صلوٰۃ اسی وحدتِ ملت کا عملی مظاہرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جس مقام پر مذہبی فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اس کا آغازِ کلام قیامِ صلوٰۃ سے کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

واقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً۔ کل حزب بما لدیھم فرحون۔ (۳۰/۳۲)

(نظامِ) صلوٰۃ کو قائم رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں فرقہ بندی پیدا کر دی اور اس طرح خود بھی ایک فرقہ بن گئے۔ اس کے بعد حالت یہ ہوگئی کہ ہر گروہ اس میں مگن ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے بس وہی حق ہے۔

اس وحدتِ ملت کے تصور کی رو سے "مختلف فرقوں کی مختلف مساجد" (یا باصطلاحِ دورِ حاضر مختلف پارٹیوں کے مختلف اجتماعات) شرک ہیں جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس طرح محلے کے افرادِ ملت، ایک مقام پر ایک وقت مقررہ پر جمع ہوں گے اور اپنے میں سے ایک نمائندہ چن لیں گے۔ اس نظام میں امام کی یہی حیثیت ہوتی ہے۔ یعنی اس علاقہ کے افرادِ ملت کا نمائندہ۔ یہ اس تنظیم جمہوریت کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ اس کے بعد مختلف علاقوں کے نمائندوں کا اجتماع اور ان کا ایک نمائندہ۔ اور ان نمائندگان میں سے ایک منتخب نمائندہ۔ یہ نمائندہ اس شہر کا نمائندہ ہوگیا۔ اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا اور یہ عمارت 'اہرامِ مصر' کی مخروطی شکل کی طرح اوپر کو اٹھتی چلی جائے گی اور اس کا سب سے اوپر کا نقطہ کعبۃ اللہ کا اجتماع ہوگا۔ (یعنی دنیا بھر کے مسلمانوں کے نمائندوں کا اجتماع) چونکہ ہم اس وقت کسی ایک خطہ کے نظام سے بحث کر رہے ہیں اس لئے ہم زیرِ نظر مقالہ میں اس تنظیم کو ایک خطہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں یعنی ایک محلہ کے افرادِ ملت کے اجتماعات سے بلند ہوتے ہوتے، مملکت کی مجلسِ مقننہ کے اجتماعات تک۔ آپ دیکھئے کہ اس تنظیم کی رُو سے کس طرح تمام افرادِ ملت ایک لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ کوئی فرد اس لڑی سے باہر نہیں رہتا۔ افرادِ ملت میں سے ہر فرد اپنی دشواریوں کو اپنے اجتماع میں پیش کریگا۔ اگر اس کا حل وہیں ہوگیا تو فبہا۔ ورنہ ان کا نمائندہ اس معاملہ کو آگے پہنچائے گا۔ اگر معاملہ ایسا اہم ہے کہ اس کا حل پچھلے اجتماعات میں نہیں مل سکتا تو وہ ملت کی آخری مجلسِ مقننہ تک پہنچ جائے گا۔ دوسری طرف، اگر کسی بات کا آغاز مجلسِ مقننہ سے ہوا ہے تو

وہ سلسلہ بہ سلسلہ، سب سے نچلے اجتماع (یعنی محلہ وار اجتماع) تک آپہنچے گی جہاں ہر فردِ ملت کے لئے موقع ہوگا کہ وہ اپنی آواز اوپر تک پہنچا سکے۔ اس طرح اوپر کی آواز ہر فردِ ملت تک، اور ہر فردِ ملت کی آواز اوپر تک پہنچ جائے گی۔ اور تمام افرادِ ملت کے درمیان وہ حقیقی رابطہ پیدا ہوجائے گا جسے قرآن نے کامیابی کا اصل راز بتایا ہے۔ ارشاد ہے:-

یاایھا الذین اٰمنوا اصبروا۔ وصابروا۔ ورابطوا۔ واتقوا اللہ۔ لعلکم تفلحون۔

اے افرادِ ملتِ اسلامیہ، تم میں سے ہر شخص خود بھی ثابت قدم رہے اور دوسروں کی ثابت قدمی کا موجب بنے۔ اس طرح سفرِ زندگی میں ہاتھوں میں باہیں ڈال کر چلتے جاؤ، باین نمط کہ تمہارا ہر قدم قانونِ خداوندی کے مطابق اٹھے۔ اسی میں تمہاری کامیابی کا راز ہے۔

افرادِ ملت میں اس قسم کا رابطہ وہ بنیاد ہے جس پر ان کی تنظیم کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی وقت دیکھا جائے کہ کوئی نمائندہ افرادِ ملت کے مفاد کی نگہداشت میں کوتاہی کررہا ہے (یعنی وہ ضابطۂ خداوندی سے ذرا اِدھر اُدھر ہٹ رہا ہے) تو اسے، اسی وقت نمائندگی سے برطرف کیا جاسکتا ہے۔ اس نمائندے کی بالآخر حیثیت کیا ہے؟ یہی کہ افرادِ ملت نے اسے، اپنی آواز اوپر تک پہنچانے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اگر افرادِ ملت دیکھیں کہ یہ "ذریعہ" صحیح کام نہیں کررہا تو اس کی اصلاح کریں اور اگر اصلاح ممکن نہیں تو اس کی جگہ دوسرا ذریعہ اختیار کرلیں۔ یاد رکھئے! اس نمائندے کی اپنی رائے کا مقام صرف وہ اجتماع ہے جس کا وہ نمائندہ ہو۔ جب کسی معاملے کے متعلق اس اجتماع نے کوئی فیصلہ کردیا تو اب اس نمائندے کا کام صرف اسقدر رہ گیا کہ وہ اس فیصلے کو ان سے اوپر کے اجتماع تک پہنچا دے۔ وہاں پہنچکر اس کی اپنی رائے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ اس طرح آپ دیکھیں گے کہ ملت کی سب سے اونچی مجلس (مجلسِ مقننہ) میں نمائندگانِ ملت کی اپنی اپنی رائے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوگا۔ وہ صرف اپنے اپنے حلقے کی آراء کا اظہار کریں گے (جن کے وہ نمائندے ہیں)۔ اس طرح تمام افرادِ ملت کی آراء اور خیالات اپنے آخری مقام تک پہنچ جائیں گے۔ مرکزِ ملت، ان آراء کی روشنی میں، جو فیصلہ کریگا وہ مملکت کا قانون قرار پا جائے گا۔ اس کے لئے ہر حلقے کو دیکھنا یہ ہوگا کہ ان کے نمائندے نے ان کی رائے، اوپر کے اجتماع تک پہنچادی ہے یا نہیں۔ چونکہ اس تنظیم میں نیچے سے اوپر تک تمام افراد ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کو اپنا ایمان سمجھیں گے اس لئے ان کی رائے کے درحقیقت معنی یہ ہوں گے کہ مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق ان کی صوابدید کے مطابق قرآن کا حکم یا منشاء کیا ہے اور اس کے اصولوں کی روشنی میں جزئی قانون کس قسم کا مرتب ہونا چاہئے۔ اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی مجلسِ مقننہ میں کسی مسئلہ پر بحث و تمحیص کا محور یہ ہوگا کہ اس باب میں قرآن کا حکم کیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ اس حکم کے مطابق جزئیات مرتب کرنے کے لئے ہماری ضروریات کے تقاضے کیا ہیں اور ہمارے موجودہ ماحول میں وہ کس طرح قابلِ عمل ہوسکتے ہیں۔

اسی سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اس تنظیم کی رو سے کسی خاص عرصہ کے بعد نئے الیکشنز کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر حلقہ اپنے اپنے نمائندے کے اعمال کا نگراں ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا رہتا ہے کہ ان کا نمائندہ ان کی صحیح نمائندگی کررہا ہے یا نہیں۔ اگر کسی وقت وہ دیکھے کہ ان کی نمائندگی صحیح طور پر نہیں ہورہی تو وہ اپنی نمائندگی واپس لے لیں گے اور اس کی جگہ دوسرا نمائندہ بھیجدیں گے۔ اس طرح

ان نمائندگان میں ساتھ کے ساتھ تبدیلی ہوتی جائے گی بشرطیکہ اس تبدیلی کی ضرورت ہو۔ اور اگر تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو گی تو وہ ان کی نمائندگی کرتے جائیں گے۔ اس میں "تبدیلی بغرض تبدیلی" کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ اس لئے خاص وقفوں کے بعد جدید انتخابات کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اس تنظیم میں ہر نمائندہ انہی لوگوں میں سے ہو گا جو اسے اپنا نمائندہ بنائیں گے۔ اس لئے وہ ان کے احساسات و جذبات اور ان کی ضروریات و مشکلات کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکے گا۔ نیز وہ ان کا حاکم بن کر نہیں رہے گا بلکہ ان کی آواز کو آگے تک پہنچانے کا واسطہ ہو گا۔ جس وقت وہ اس فریضۂ وساطت کی سرانجام دہی میں کوتاہی کرے گا اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔

---

یہ ہے اسلامی جمہوریت کی وہ تنظیم جسے قرآن نے ایسا شجرِ طیب بتایا ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان بوس (کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء)۔ آپ کسی درخت کی تنظیم کو دیکھئے۔ اس میں تمام اجزا کس طرح باہم مربوط ہوتے ہیں۔ اس کی جڑیں زمین سے پانی چوستی ہیں تو اس کی نمی ایک ایک پتے تک پہنچ جاتی ہے اور سارا درخت سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ اگر اس کے پتے سورج کی کرن سے ذرا سی حرارت مستعار لیتے ہیں تو اس حرارت کا اثر جڑوں تک پہنچ جاتا ہے اور اس سے درخت کی رگ حیات تپش آمادہ ہو جاتی ہے۔ اگر سوکھتا ہے تو سارا درخت سوکھتا ہے اور اگر سرسبز ہوتا ہے تو سارے کا سارا سرسبز۔ اس کا ہر رگ و ریشہ اس چیز کو آگے پہنچاتا ہے جو اس تک پہنچتی اور اس میں سے اپنے لئے کچھ نہیں رکھ لیتا۔ اسے وہی کچھ ملتا ہے جو اس نظام کی رو سے اس کے حصہ میں آتا ہے۔ یہی وہ تنظیم جس سے ملت کا ہر فرد مرکز سے پیوست رہتا ہے اور مرکز ہر فرد سے مربوط۔ اس کا نام ہے جمہوریت۔ اس کو کہتے ہیں ڈیماکریسی۔ یعنی ساری ملت کی حکومت۔ بشرطیکہ "حکومت" کا لفظ ضرور استعمال کرنا چاہیں۔ ورنہ قرآن کی رو سے اس کا نام نظامِ مشاورت ہے۔ (وامرھم شوریٰ بینھم)

---

آجکل "اسلامی نظام" کا عام چرچا ہو رہا ہے اور پاکستان کے دستور کا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ مختلف سمتوں سے کوشش ہو رہی ہے کہ یہ دستور ان کے منشا یا ان کے تصورِ اسلام کے مطابق مرتب ہو۔ لیکن آپ جس قسم کا جی چاہے دستور بنا لیجئے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پھر رہے گی کہ اسلامی نظام کی عملی تشکیل کی صورت صرف اسلامی تنظیم ہے۔ جب تک آپ پوری کی پوری ملت کی تنظیم ان خطوط پر نہیں کریں گے، اسلامی نظام کبھی صورت پذیر نہیں ہو سکے گا۔ اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

جب تک افرادِ ملت اس نظام میں برابر کے شریک نہیں ہوں گے یہ اسلامی نظام نہیں ہو گا۔ اس نظام میں مرکزِ ملت اور افرادِ ملت میں غیر منقطع واسطہ ہونا ضروری ہے۔ اس میں ہر فرد کی آواز مرکز تک پہنچنی چاہئے اور مرکز کے فیصلے افراد کے ہاتھوں نفاذ پذیر ہونے چاہئیں۔ مرکز اور افراد کے درمیان کوئی حاجب اور دربان نہیں ہونا چاہئے۔ حضرت عمرؓ نے جب حکم دیا تھا کہ مصر کے گورنر نے اپنے مکان کے

آگے جو ڈیوڑھی بنا لی ہے اسے مسمار کر دیا جائے تو وہ حکم اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا تھا۔ وہی نظام نظامِ خداوندی کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جس میں "مرکز ہر فرد کی پکار سنے اور اس پکار کا جواب دے"۔ جس نظام میں افرادِ ملت اور مرکز کے درمیان دیواریں کھڑی ہو جائیں وہ نظام کبھی نظامِ خداوندی نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی نظام اسلامی ہے یا نہیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نظام کی بنیاد اسلامی تنظیم پر ہے یا نہیں۔ اس وقت دستورِ پاکستان کے متعلق ملک میں جو کشمکش جاری ہے اس میں اسلامی تنظیم کا کہیں ذکر نہیں آرہا۔ یہ تصور کسی کے سامنے ہی نہیں۔ مُلّا کے نزدیک اسلامی نظام سے مفہوم یہ ہے کہ جو مسئلہ پیش ہو اس کے متعلق مُلّا سے استصواب کیا جائے۔ اگر وہ اسے "کتاب و سنت" کے مطابق کہدے تو اسے قانون بنا دیا جائے اور اگر وہ اسے خلافِ شریعت قرار دیدے تو اسے مسترد کر دیا جائے۔ یعنی قانون سازی کے آخری اختیارات مُلّا کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں۔ اور اس کے فیصلے کو "خدا اور رسول" کا فیصلہ سمجھا جائے۔ نہ مُلّا کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ اسے افرادِ ملت اپنا نمائندہ منتخب کریں اور نہ اس کی احتیاج کہ وہ افرادِ ملت سے مشورہ کرے۔ دوسری طرف "مسٹر" کے نزدیک اسلامی نظام سے مفہوم یہ ہے کہ تین سال یا پانچ سال کے بعد کسی مجلس میں عوام سے پرچیاں ڈلوالیں اور اس طرح جو شخص ممبر منتخب ہو گیا اسے اتنے عرصے کے لئے ان عوام پر حکومت کرنے کا لائسنس مل گیا۔ اور اس کا نام قرار پا گیا جمہوری نظامِ حکومت جو عین اسلامی ہے، کیونکہ (ان کے قول کے مطابق) اسلام جمہوریت کا مذہب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ مُلّا کا تصور اسلامی ہے نہ مسٹر کا۔ اسلامی تصور یہ ہے کہ پوری کی پوری ملت اس محکم اصول کو اپنا نصب العین قرار دے کہ

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔

جو جماعت اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتی وہ مومن نہیں، کافر ہے۔

اور اس کے بعد یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی خاص معاملہ میں قرآنی حکم کی عملی تعبیر کیا ہے، تمام ملت سے مشورہ کیا جائے۔ اس مشورہ کی عملی شکل، وہ اسلامی تنظیم ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی فرد یا کوئی پارٹی، باقی افرادِ ملت پر حکومت نہیں کرے گی۔ افرادِ ملت اپنے معاملات کا نظم و نسق، قرآنی منشاء کے مطابق آپ کریں گے۔

لہٰذا سب سے بنیادی سوال، اسلامی تنظیم کا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ دستورِ پاکستان میں اس کی صراحت واضح الفاظ میں کر دی جائے کہ "مشاورت" کے لئے تنظیم کی شکل کیا ہو گی۔ موجودہ الیکشنوں کا طریق تو کسی صورت میں بھی اسلامی تنظیم نہیں کہلا سکتا۔ اسلامی تنظیم میں ہر فرد کو ملت کی مشینری کا ایک فعال پرزہ ہونا چاہئے۔ اب یہ کام اربابِ بست و کشاد کا ہے کہ وہ سوچیں کہ اس مقصد کے حصول کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے۔ جس دستور میں مرکز، افرادِ ملت کے دلوں کی دھڑکن کا آلۂ ارتعاش (SEISMOGRAPH) نہیں بنتا وہ دستور اسلامی نہیں کہلا سکتا۔

بہ نستعین

# یہ کراچی ہے

(محترم عرشی صاحب)

میں اکتوبر کی ۳۰ تاریخ کو لاہور سے کراچی روانہ ہوا اور ۲۴ نومبر کو واپس لاہور پہنچا۔ واپسی پر ہر ملنے والے نے مجھ سے کراچی کے متعلق مختلف سوال کئے۔ میں نے ہر سننے والے کے ذوق کے مطابق جواب دیئے۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سفر کا کچھ خلاصہ قارئین طلوع اسلام تک بھی پہنچ جائے۔

مختصر یوں سمجھئے کہ کراچی اس وقت نہ صرف ہماری حکومت و ریاست کا مرکز ہے بلکہ تجارت کی بھی سب سے بڑی منڈی ہے۔ تمول کا سب سے بڑا خزانہ ہے، افلاس کا بہت بڑا شہر ہے، گناہوں کی عالمگیر ٹکسال ہے، گندم نمائی اور جوفروشی کا آباد بازار ہے، عدالتوں میں شنوائی نہیں، دفتروں میں پذیرائی نہیں، حاکم کے پاس انصاف نہیں، تاجر کے پاس خلوص نہیں، مولوی ایمان سے بے بہرہ، واعظ حق گوئی سے عاری۔ شہر کے تمام بازار آبادی سے اٹے ہوئے، لیکن دل ویران، الا ماشاء اللہ ــــ جو کچھ آج ہو رہا ہے، اس کا جو نتیجہ کل ہونے والا ہے اس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے ــــ یہ صرف کراچی کی بات نہیں، کراچی کا ہر بال، ہر فیشن، ہر خوبی اور ہر برائی تقسیم ہوتی ہے اور ملک کے کونے کونے میں بقدر ظرف پہنچ رہی ہے۔

میں نے زندوں کے اس قبرستان میں ایک آواز سنی، ایک آواز جس کا سننے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا، ایک شخص ہے، جو لاشوں کو خطاب کرتا ہے اور بول بول کر خاموش ہو جاتا ہے، پھر دم لے کر بولنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی طاقت اسے بولنے پر چیخنے پر مجبور کر رہی ہے۔

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

ہر اتوار کی صبح ۹ سے ۱۱ بجے تک پرویز صاحب کے ہاں ایک صحبت ہوتی ہے۔ بیس کے لگ بھگ احباب جمع ہو جاتے ہیں، وہ قرآن کی ایک آیت لیکر بولنا شروع کر دیتے ہیں ــــ میں نے بہت درس سنے اور بے شمار تفسیریں دیکھی ہیں۔ عموماً یہی انداز پایا کہ صاحب درس یا مفسر خدا کی ابدی کتاب کو پیچھے کی طرف، صدیوں پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے، ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، مجاہد اور قتادہ وغیرہم سے آگے بڑھنے کی قوت مفقود ہے ــــ وہ پہلی ہی ایک دو صدیوں سے قرآن کو باندھ کر رکھ دیتا ہے۔ روایتی شانِ نزول کے چکر سے آگے نہیں نکل سکتا ــــ لیکن یہاں یہ دیکھا کہ قرآن آگے جا رہا ہے۔ ہیگل، مارکس، لینن، آئن سٹائن اور نہ جانے کیسے کیسے نام آتے ہیں، جہاں یہ لوگ ٹھہر جاتے ہیں، ان کو کوئی راستہ نظر نہیں آتا، وہاں قرآن کی ایک چھوٹی سی آیت عالم افروز مشعل لئے ہوئے نمودار ہوتی ہے اور مستقبل کی فضائیں جگمگا اٹھتی ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا، سنتا تھا اور کڑھتا تھا کہ یہ آواز محدود کیوں ہے۔ فضائے کائنات میں یہ زندگی بخش گیت کیوں نہیں بکھر جاتا؟

خدا کے فرشتے (والناشرات نشرا) کہاں ہیں؟ وہ اس دولت سرمدی کو اپنے پروں پر اٹھا کر دنیا کے کونے کونے میں کیوں نہیں پہنچا دیتے۔ دنیا پیاسی ہے امن کی ــــ آج کی منہائے ترقی پر پہنچی ہوئی دنیا کے پاس ہر علم و فن، ہر ایجاد و ہنر اور ہر قسم کے مال و متاع کے خزانے موجود ہیں۔ اگر نہیں تو صرف ایک چیز ــــ امن ــــ امن ــــ اے امن تو کہاں ہے۔ اے سچی انسانیت تو کہاں ہے؟ کہیں نہیں ــــ فلسفے میں نہیں، سائنس میں نہیں، دولت کے اتھاہ خزانوں میں نہیں، سیاست کے کمالات میں نہیں، ایجاد و اختراع کی قوتوں میں نہیں ــــ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے درندگی، درندگی۔ فریاد، فریاد ــــ انسانیت کی لازوال دولت، امن عالم کی سرمدی جنت، قرآن اور تنہا قرآن میں ہے، لیکن وہ قرآن نہیں جو مفسروں، محدثوں، فقیہوں، فریسیوں، راہبوں اور صوفیوں کی کروڑوں کتابوں کے نیچے دبا ہوا کراہ رہا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

یہ تو ہفتہ وار صحبت کا ذکر تھا، اس کے علاوہ ہفتے میں دو مرتبہ شام کے وقت ایک اور بھی مختصر و محدود صحبت سفیر مصر عبدالوہاب عزام بے صاحب کے دولت کدے پر منعقد ہوتی ہے، مجھے اس اجتماع میں بھی باقاعدہ حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا، یہاں بھی میر مجلس یا صاحب درس پرویز صاحب ہی ہوتے ہیں۔ اس مجلس میں کلام اقبال کی شرح دو گھنٹے تک بیان کی جاتی ہے۔ محترم سفیر مصر پہلے بھی کلامِ اقبال کے بعض اجزا کو نظم عربی کا لباس پہنا چکے ہیں اور فی الحال بھی اس مفید و لطیف شغل کو جاری کئے ہوئے ہیں۔ ان دنوں ارمغانِ حجاز کے حصہ اردو کی شرح ہو رہی تھی ــــ ابلیس اور اس کے مشیر مصروف مکالمہ ہیں۔ محترم شارح کی زبان سے ایسے ایسے نکتے سننے میں آئے کہ خود مصنف علیہ الرحمہ بھی ہوتے تو اس سے بہتر کیا کہہ سکتے۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے تاریخ و فلسفہ کی وسیع واقفیت و استحضار کے ساتھ قرآن حکیم پر بھی حکیمانہ نظر کی ضرورت ہے اور اقبال پر لکھنے اور بولنے والوں میں یہ جامعیت خال خال نظر آتی ہے اور خوش قسمتی سے پرویز صاحب کو فطرت نے ایسا ہی جامع ذہن عطا کیا ہے۔

ایک دن ان کے اپنے دولت کدے پر علامہ مرحوم کے انگریزی لکچروں کا ذکر ہوا، میں انگریزی نہیں جانتا، اس دن پہلی مرتبہ مجھے ان لکچروں کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ آج تک بڑے بڑوں سے عموماً یہی سن رکھا تھا کہ یہ لکچر سخت مشکل اور ادق ہیں، ہندوؤں کے چار ویدوں کی طرح ان چھ لکچروں کا پورا پنڈت بھی کمیاب ہی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے ان کے سننے اور سمجھنے کا بے حد شوق ہے، میں اس کا اظہار علامہ مرحوم سے بھی کر چکا تھا، لیکن اب تک تکمیل شوق کا کوئی سامان نہیں ہو سکا۔ پرویز صاحب کی گفتگو نے اس شوق کو اور بھڑکا یا، انھوں نے بتایا کہ علامہ کا اصلی کارنامہ یہی لکچر ہیں۔ اس میں انھوں نے قدیم و جدید فلاسفہ میں سے ہر مکتب خیال کے امام کے تمام فلسفے کو صرف ایک سطر میں سمیٹ لیا ہے، پھر دوسری ایک ہی سطر میں، اس پر نپی تنقید اور تیسری سطر میں اس کے متعلق قرآن حکیم کا حتمی فیصلہ دیدیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے علامہ کی وسعت نظر، دراکی، کمال جامعیت، اعجاز تنقید اور قرآن حکیم سے گہرا شغف ظاہر ہوتا ہے ــــ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس کتاب کے مطالعہ کا حق پوری طرح ادا کیا ہے اس کے اندر مذکور تمام حکمار قدیم و جدید کی تصانیف مہیا کیں، بعض کے حصول میں سخت دشواریاں پیش آئیں، صبر اور کوشش سے ان کو بھی حل کیا ــــ اسی صحبت میں انھوں نے

بتایا کہ ان کے سامنے اس وقت کتنے کام ہیں۔

۱ ـــــ علامہ کے ان لکچروں کو اردو کا لباس پہنانا، ان پر ایک مبسوط مقدمہ لکھنا، تن کے ساتھ ساتھ مناسب تشریحی حواشی دینا (میں یہ کہنا بھول گیا کہ ان لکچروں کو سمجھنے والے کم تعداد ہی میں سہی اور اصحاب بھی ہو سکتے ہیں، لیکن دوسروں کو سمجھانا، الگ فن ہے، اس میں فی الحال شاید پرویز صاحب ہی منفرد ہوں)

۲ ـــــ لغات غریب القرآن یعنی قرآن مجید کے خاص خاص اہم الفاظ کا ایک لغت مرتب کرنا۔ جہانتک میں سمجھتا ہوں امام راغب پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے اس موضوع پر بالغ نظری سے قلم اٹھایا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ روایات سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے یا انھوں نے غیر محدود قرآن کی تمام وسعتوں کو سمیٹ لیا ہے ـــ یہ کام آگے سے آگے بڑھ کر کرنے کا ہے اور صرف ایک شخص نہیں، ایک صحیح النعم جماعت کے کرنے کا ہے، لیکن جب تک جماعت میسر نہ آئے، کسی فرد واحد سے بھی قرآن کی جتنی خدمت ہو سکے غنیمت ہے۔

۳ ـــــ "معارف القرآن" کے باقی مجلدات کی تکمیل۔ ان کا موضوع مجھے یاد نہیں رہا۔ وقتی مضامین کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ تینوں کام بھی غالباً بیک وقت شروع کر رکھے ہیں، دن اور رات کے وقتوں میں جس وقت بھی میں ان کے ہاں پہنچا انھیں تحریر کے کام میں مشغول پایا۔ جسم کی نازک صحت کے ساتھ دماغ سے گھنٹوں نہیں پہروں کام لیتے ہیں۔ میں نے نہایت سختی اور دکھ کے ساتھ محسوس کیا کہ ان کے عزائم وسیع، مقاصد عالمگیر لیکن ذرائع محدود سے بھی محدود تر۔

اے بسا علمے کہ از بے التفاتی ہائے خلق
درضمیر معنی آگاہاں ہماں مستور ماند
(بیدل)

یہ ہے میرے سفر کراچی کی روئداد کا ایک المناک گوشہ۔

---

# نہایت ضروری اعلان

یکم جنوری ۱۹۵۳ء سے ادارۂ طلوع اسلام کا دفتر رالبسن روڈ سے، بندر روڈ (چوک سول ہسپتال) پر منتقل کر دیا گیا ہے اس لئے آئندہ تمام مراسلات میں اس تبدیلیٔ پتہ کا خیال رکھئے

یاد رکھئے

آئندہ سے طلوع اسلام کا پتہ یہ ہے

## دفتر ادارۂ طلوعِ اسلام بندر روڈ۔ چوک سول ہسپتال۔ کراچی

# سلیم کے نام...

## (مقامِ رسالت)

یہ تو سلیم! میں نے اسی دن سمجھ لیا تھا جب پچھلا خط لکھا ہے کہ تم مقامِ نبوت سمجھ لینے کے بعد ضرور پوچھو گے کہ مقامِ رسالت کیا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے میں سمجھتا ہوں اُن الفاظ سے زیادہ موزوں الفاظ شاید ہی کہیں اور ملسکیں جن سے علامہ اقبالؔ نے اپنے پانچویں خطبہ کا افتتاح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچکر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا"

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرہ کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کردیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس نہیں آنا چاہتا۔ اور جب واپس بھی آتا ہے (اسلئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کردے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کردیں۔ یہ آرزو، کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہوجائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے' اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے۔ اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے' وہ کس انداز کی ہے۔

جیسا کہ میں "معراجِ انسانیت" میں لکھ چکا ہوں' حقیقتِ کلی کا ادراک خاصۂ نبوت ہے۔ یہ یکسر وہبی ہوتا ہے' اور غیر از نبی اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ اکتسابی طور پر ادراکِ حقیقت کی جو کوششیں کی جاتی ہیں' ان سے انسان کی بعض داخلی قوتوں کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہوجاتی ہے۔ ایسا شخص اس چیز کو مدارجِ انسانیت کا معراجِ کمال سمجھ کر کیف و مستی کی انفرادی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ نوعِ انسانی کے لئے اس کے پاس کوئی پیام نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے' نبی کو مشاہدۂ حقیقت اسلئے کرایا جاتا ہے کہ

وہ ضمیرِ کائنات سے وہ پیغام اپنے ساتھ لائے جس سے انسانوں کی دنیا میں انقلاب پیدا ہو جائے اور وہ اس صورِ اسرافیل سے معاشرہ میں حشر برپا کر دے۔ وہ اس ادراکِ حقیقت سے اُن مفاسد کی علت العلل کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے جن کی وجہ سے معاشرہ کی کوئی شے اپنے صحیح مقام پر باقی نہیں رہتی۔ اس تشخیص کے بعد ان مفاسد کا علاج بھی اس کی نگاہوں کے سامنے کھلے کھلے انداز میں آجاتا ہے۔ یہ ہے منصبِ نبوت۔ یعنی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لینا۔ رموزِ کائنات سے اس طرح آگاہ ہو جانے سے انسان جس بے پناہ لذت سے کیف اندوز ہوتا ہے اس کا کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کی توجہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی دوسری طرف منعطف ہو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

لیکن ایک نبی پر انکشافِ حقیقت اس لئے نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی کیف آور لذتوں میں جذب ہو کر رہ جائے، اس سے بہت بڑا کام لینا ہوتا ہے اور یہ قوتیں درحقیقت اُس مقصدِ عظیم کے حصول کے ذرائع ہوتی ہیں۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ

دیکھا ہے جو کچھ تو نے اوروں کو بھی دکھلا دے!

اور اس طرح انسانوں کی دنیا میں وہ تحیر انگیز انقلاب پیدا کر دے جس سے آغشتۂ خاک و خون آدم، شرفِ انسانیت کی بلندیوں تک جا پہنچے۔ اسے منصبِ رسالت کہتے ہیں۔ یعنی وحی کی روشنی میں انسانی معاشرہ میں انقلاب آفرینی۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہو گا سلیم! کہ نبوت بلا رسالت، بے معنی ہے اور رسالت بلا نبوت ناممکن۔ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ایک قوت ہے اور دوسری اس کی عملی تعبیر، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہا گیا ہے اور کہیں رسول۔ منصبِ رسالت (یعنی پیام رسانی اور انقلاب آفرینی) کی یہ ذمہ داریاں اتنی اہم اور صبر آزما ہوتی ہیں کہ جب نبی اکرمؐ ان سے عہدہ برا ہوئے ہیں تو قرآن نے کہا کہ

ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك (۹۴/۲)

اور ہم نے تجھ سے تیرا وہ بوجھ اتار دیا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی۔

یہی تھیں وہ ذمہ داریاں جن کی طرف آپ کو اس وقت بلایا گیا جب آپ غارِ حرا کی تجردگاہ میں نبوت سے سرفراز کئے گئے اس وقت ندائے جمال نے آپ کو پکارا اور کہا کہ

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ[1] قُمْ

سلیم! اس خطاب (مدثر) پر غور کرو۔ آنے والی ذمہ داریوں کی تصویر سامنے آجائے گی۔ جب پرندے اپنے گھونسلوں کو درست کرتے ہیں تو اسے تدثیر کہتے ہیں۔ اسے انگریزی میں کہیں گے (TO SET ONE'S HOUSE IN ORDER) اسی لئے نہایت اچھے منتظم کو دثرا لمحال

---

[1] اس کے معنی کئے جاتے ہیں

اے کپڑا اوڑھنے والے۔ اُٹھ

[یہاں سے سورہ مدثر کی آیات مسلسل آتی جائیں گی۔]

کہتے ہیں۔ جب درخت خزاں کے بعد نئی کونپلیں اور پتے نکالتے ہیں تو اسے بھی تدثیر کہتے ہیں۔ لہٰذا المدثر کے معنی ہوئے

کائنات کو سنوارنے والا۔

انسانیت کے بگڑنے کو درست کرنے والا۔

آدمیت کی شاخِ خزاں دیدہ کو گلہائے رنگا رنگ سے جلوہ بار کرنے والا۔

لہٰذا کہا یہ گیا کہ اے وہ جس کے ذمے اس قدر اہم فرائض عائد ہوتے ہیں۔ قُمْ!

خیز و بخاکِ تشنہ بادۂ زندگی فشاں

اُٹھ! اور اس انقلاب آفریں دعوتِ حق و صداقت سے دنیائے انسانیت میں حیات انگیز تحرک پیدا کر دے جس سے تمام نظامہائے کہن کی بنیادیں ہل جائیں اور بساطِ کائنات جدید خطوط پر متشکل ہو جائے۔

| | |
|---|---|
| خیز و قانونِ اخوت ساز دہ | جامِ صہبائے محبت باز دہ |
| باز در عالم بیار ایامِ صلح | جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح |
| باز ایں اوراق را شیرازہ کن | باز آئینِ محبت تازہ کن |

قُمْ! اُٹھ۔ اور فَاَنْذِرْ۔

نذر کے معنی تو تم جانتے ہی ہو سلیم! منت ماننا۔ جس چیز کو انسان اپنے اوپر واجب قرار دے لے، اسے نذر کہتے ہیں۔ یہیں سے انذار ہے جس کے معنی ہیں کسی کو اس کے فرائض و واجبات کی یاد دلانا۔ جب کسی معاشرہ میں فساد (ناہمواریاں) عام ہو جائیں تو اس وقت بعض افراد ضرور ایسے ملیں گے جنہیں اس کا احساس ہوگا کہ انسانیت غلط راستے پر جا رہی ہے۔ لیکن نہ تو انہیں یہ معلوم ہوگا کہ صحیح راہ کونسی ہے اور نہ ہی یہ کہ معاشرہ کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کا طریق کیا ہے۔ ان کے دل میں فقط ایک تڑپ ہوگی، خلش ہوگی، تپش ہوگی۔ اس کا احساس ہوگا کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہے، لیکن اس کا علاج کچھ نہیں سوجھے گا۔ یعنی ان لوگوں میں زندگی کے آثار ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو رسول کی اِس دعوتِ انقلاب پر سب سے پہلے لبیک کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے:۔

لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا … (۳۶/۷۰)

تاکہ تو اسے اس کے واجبات سے آگاہ کرے جس میں زندگی کے آثار ہیں۔

اس مقصدِ عظیم (مشن) کو اپنے ساتھ لیکر نبی سے اتر کر حرا سے سوئے قوم آتا ہے اور ان پیکروں کو اپنے گرد جمع کرنے کی دعوت دیتا ہے جن میں زندگی کے امکانات ہوتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے ان کی نگاہوں میں معاشرے کی اقدار بدلتا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو سلیم! کہ

قیمت ہر شے ز انداز نگاہ

کائنات کا سارا نقشہ اقدار (VALUES) کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ جس قسم کی اقدار ہوں گی اسی قسم کا معاشرہ ہوگا۔ اقدار بدل دیجئے معاشرہ خود بخود بدل جائے گا۔ جوڈ کے الفاظ میں "اگر تم اقدار کے متعلق تصورات بدل دو تو اس سے انداز زیست بدل جائے گا۔ اسی کا نام معاشرہ

کی تبدیلی ہے۔ (DECADENCE)۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں بڑائی کے معیار کیا ہوتے ہیں؟ (خود اپنے ہی معاشرہ پر غور کرو، کہ اس سے زیادہ بگڑا ہوا معاشرہ اور کہاں ملے گا؟) بڑائی کے معیار؟ دولت کی فراوانی (بلا تمیز اس کے کہ دولت کہاں سے آئی ہے اور کس طرح حاصل کی گئی ہے)۔ جاہ و منصب (بلا تفریق اس کے کہ وہ منصب حاصل کس طرح کیا گیا ہے اور اس صاحبِ منصب میں اس کی اہلیت بھی ہے یا نہیں)۔ قوت و اقتدار (اس شرط کے بغیر کہ اس قوت کو استعمال کس طرح کیا جا رہا ہے)۔ یہی ہیں ناں تمہارے معاشرے میں بڑائی کے معیار؟ اور انہی معیاروں کا ماحصل ہے ناں وہ جہنم جس میں سارا معاشرہ مبتلا ہے؟ رسول آتا ہے اور سب سے پہلے بڑائی کا معیار بدل دیتا ہے۔ اس کی دعوت کی بنیاد ہوتی ہے ــــ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ[1] ــــ بڑائی اور کبریائی راز ربوبیت میں ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ تعریف و توصیف کا مستحق صرف وہ ہے جو ربوبیت عامہ کا کفیل ہے۔ یہی معیارِ تکریم و تعظیم ہے۔

اس اعلانِ عظیم کے بعد، رسول کو وہ اصولی ہدایات دی جاتی ہیں جن پر اس کی دعوتِ انقلاب کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں، اس سے کہا جاتا ہے کہ

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ[2]

تمہیں یاد ہے سلیم! جب ہم سرحد گئے تھے تو ایک گاؤں سے باہر ایک شخص ٹیلے پر کھڑا زور زور سے کپڑا ہلا رہا تھا اور لوگ (اس کپڑے کو دیکھ کر) اس کے گرد جمع ہوتے جا رہے تھے۔ زمانۂ قدیم میں لوگوں کو پکارنے کا یہی ذریعہ تھا۔ اس سے انہیں دعوت دی جاتی تھی۔ اسے عربی زبان میں تثویب کہتے ہیں (ثوب کے معنی کپڑا) چنانچہ مؤذن کے الفاظ (الصلوۃ خیر من النوم۔ وغیرہ) تثویب کہلاتے ہیں لہٰذا ثیاب کے معنی ہیں دعوت اور طہّر کے معنی ہیں دور رکھنا۔ بنا بریں

وثیابك فطهر

کے معنی یہ ہوئے کہ اپنی دعوت کو ہر قسم کے ناخوش آئند عناصر (*Undesirable Elements*) سے دور (پاک) رکھ۔ اس تحریک میں صرف وہ لوگ شامل ہو سکیں گے جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی رکھتے ہوں گے۔ جس کے دل میں کوئی خباثت آلود مقصد ہوگا، اُسے اس تحریک سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ صاف اور شفاف دعوت۔ پاکیزہ اور نکھری ہوئی تحریک۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحریک میں شامل ہونے والوں کے عزم میں استواری اور کیرکٹر میں پختگی ہونی ضروری ہے جو ذمہ داریوں کے بوجھ سے لڑکھڑا جائے یا جس کے پائے استقلال میں لغزش آجائے، وہ اس تحریک کے شایانِ شان نہیں ہوگا۔ اس لئے کہہ دیا گیا کہ

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ[3]

تم نے بعض اونٹوں کو دیکھا ہوگا سلیم! بیٹھتے وقت ان کی پچھلی ٹانگیں کانپتی اور لڑکھڑاتی ہیں۔ یہ کمزوری کی نشانی اور اونٹوں کی خاص

---

[1] اس کے عام معنی کئے جاتے ہیں - اپنے رب کی بڑائی کر

[2] " " " " - اپنے کپڑوں کو پاک رکھ

[3] " " " " " اور ناپاکی سے دور رہ۔

بیماری ہوتی ہے اسے رجز کہتے ہیں۔ لہٰذا اس تحریک میں شریک ہونے والوں میں رجز نہیں ہونا چاہئے کہ ذمہ داریوں کے بوجھ سے ان کے پاؤں میں لغزش آجائے۔ جس میں اس قسم کی کمزوری کا شائبہ دکھائی دے اسے مناسب تعلیم وتدریس اور تزکیہ (سامانِ نشوونما کی بہم رسانی) سے دور کردینا ضروری ہے۔ والرجز فاھجر۔ یہ ہے اس تحریک کا تیسرا عمود۔

اول - اقدار کا بدل دینا اور صرف ربوبیت کو کبریائی کا معیار قرار دیدینا۔ وربک فکبر۔

دوم - اس دعوت کو فساد انگیز اور خباثت آلود محرکات وعناصر سے پاک وصاف رکھنا۔ اور

سوم - ان تمام امکانات کو دور کردینا جن سے افراد کارواں کے پائے استقلال میں لغزش کا اندیشہ ہو۔

اب آگے بڑھئے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جو صرف اپنا دل اور جان لے کر آئیں گے۔ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی (دنیاوی) متاع نہیں ہوگی۔ اور وہ لوگ بھی جن کے پاس سامانِ زندگی کی فراوانی ہوگی۔ تحریک ربوبیت میں یہ ساز وسامان اول الذکر لوگوں کو بھی دیا جائے گا۔ دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کچھ دیتا ہے تو یا تو اس سے زیادہ مقدار میں واپس لینے کے خیال سے دیتا ہے اور یا (کم از کم) احسان مندی کے طور پر۔ احسان مندی کے معنی یہ ہیں کہ جس پر احسان کیا ہے وہ تمام عمر تمہارا بے دام غلام رہیگا وہ ہر بات تمہاری مرضی کے مطابق کرے گا۔ جونہی اس نے کوئی بات تمہاری مرضی اور منشا کے خلاف کی، تم نے جھٹ سے اُسے احسان فراموش اور کمینہ کہکر ذلیل کردیا۔ لیکن تحریک ربوبیت میں ان جذبات وتصورات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا تمام تر دار "دینے" میں ہے "لینے" میں نہیں۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے وہ "دیگا" اور اس کے بدلے میں نہ کسی معاوضہ کی خواہش کریگا نہ احسان رکھے گا۔ ان میں سے ہر ایک کا اصول یہ ہوگا کہ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا۔ (میں اس کے لئے تم سے کسی معاوضے کا خواہشمند نہیں ہوں)۔ اس لئے اس تحریک کا چوتھا اصل یہ ہے کہ

لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ

اس خیال سے احسان نہ کر کہ اس کے بدلے میں زیادہ ملے گا۔

بلکہ ربوبیتِ عامہ کے لئے استقامت پذیر رہو۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن پر اس دعوت کی تعمیر استوار ہوگی۔

---

اس کے بعد اس حقیقت کو بھی واشگاف کردیا گیا کہ یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بچھونا ہے۔ اس آواز کی ہر طرف سے مخالفت ہوگی اور وہ وقت بھی آجائے گا جب اس مخالفت کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کرنا ہوگا۔ لیکن مخالفت کے ابتدائی مراحل ہوں یا آخری شکل۔ ہر مرحلہ اور ہر قدم پر اس حقیقت پر یقینِ محکم رکھو کہ آخر الامر کامیابی تمہاری ہی ہوگی، اس لئے کہ جو معاشرہ ذاتی مفاد پرستیوں کے سہارے پر قائم ہو وہ نظامِ ربوبیتِ عامہ کے مقابلہ میں کبھی ٹھہر نہیں سکتا۔ اسلئے

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ

جب لڑائی کا بگل بجایا جائے گا

تو اُس وقت واقعی بڑی مشکلوں کا سامنا ہوگا (فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ) لیکن یہ تمام مشکلات تمہارے لئے آسان ہو جائیں گی اور فریقِ مخالف ان کے شکنجے میں جکڑا جائے گا۔ (عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ)۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان ابتدائی مراحل میں، جب ہنوز اپنی جماعت زیرِ تشکیل و تربیت ہوگی، مخالفین کی دشنام طرازیوں اور شر انگیزیوں کا کیا جواب دیا جائے! یہ مرحلہ واقعی بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ مخالف قوتیں اپنی دسیسہ کاریوں کے طرح طرح کے حربے استعمال کرتی ہیں تاکہ وہ قوت جو اس جماعت کی تعلیم و تربیت اور تشکیل و تنظیم میں صرف ہونی ہے اُن حربوں کی مدافعت میں ضائع ہو جائے۔ شر انگیزی کے یہ تیر میدانِ جنگ کی تیغ و سنان سے کہیں زیادہ زہر آلود اور زخم آور ہوتے ہیں۔ اگر اس جماعت کے افراد ان شرارتوں میں الجھ جائیں تو ان کی ساری توانائی اس میں ضائع ہو جاتی ہے اس لئے اس مقام پر بار بار تاکید کی جاتی ہے کہ دیکھنا! کہیں ان باتوں میں الجھ کر نہ رہ جانا۔ اس وقت تمہاری کامیابی اسی میں ہے کہ ان سے دامن بچا کر نہایت خوشگواری سے آگے بڑھ جاؤ۔ (فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ۔ 15/85)۔ دوسری جگہ ہے

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۔ (73/10)

جو کچھ یہ مخالفین کہتے ہیں اس سے دل برداشتہ مت ہو جاؤ، ہمت سے کام لو اور نہایت خوش اسلوبی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے انھیں چھوڑ کر آگے نکل جاؤ۔

تم اپنے کام میں لگے رہو اور انھیں میرے حوالے کر دو۔ میرا قانونِ مکافاتِ عمل ان سے نپٹ لے گا۔ (ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا)۔ یہ مخالفت کرنے والا وہ ہے جسے ہم نے تنہا پیدا کیا تھا۔ نہ اس کے ساتھ مال و دولت تھی نہ سامانِ قوت و حشمت۔ یہ تمام دولت اور قوت جن کی بنا پر یہ اس طرح سرکش و عنید ہو رہا ہے اس غلط نظام کی پیدا کردہ ہیں۔ ہمارا قانون ان ہلاکت سامانیوں کو تباہ و برباد کر دیگا۔ ہم نے اسے فراواں مال دیا۔ (وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا) اور آل اولاد جن کے زور پر یہ اس قدر بپھرا ہوا ہے (وَبَنِينَ شُهُودًا)۔ فرس شاہد کہتے ہیں ایسے گھوڑے کو جو دوڑنے میں اپنی تمام قوت صرف کر دے۔ اس لئے بنین شہود وہ ابنائے خاندان ہیں جو مخالفت میں اپنی پوری قوت صرف کر دیں۔ ہم نے اس کی زندگی کے راستے ہموار کر دیئے۔ (وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا)۔ اب یہ چاہتا یہ ہے کہ ہم اس کے اس ساز و سامان میں اور اضافے کرتے جائیں جن سے یہ ہمارے قانون اور ضابطہ کی مخالفت میں اور بھی سرکش ہوتا جائے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ (ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۔ كَلَّا ۔ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا) اب وہ جماعت وجود پذیر ہوگئی ہے جس کے ہاتھوں ہمارا ضابطۂ قانون ایک نظام کی صورت میں متشکل ہو جائے گا۔ اسی جماعت کے ہاتھوں یہ مفاد پرست گروہ مصیبتوں میں پھنسیگا۔ (سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا)۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ غارِ حرا سے اتر کر ایک رسول کے سامنے کیا پروگرام ہوتا ہے۔ اب تم نے سمجھا کہ سورۃ المدثر کی ان آیات کا مفہوم کیا ہے جن کے متعلق تم کہہ رہے تھے کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ تم سچے ہو سلیم! ان ترجموں سے قرآن کس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے؟

اس جملۂ معترضہ کے بعد آگے بڑھو۔ اتنا کچھ بیان کرنے کے بعد قرآن نے ایک عالمگیر حقیقت کو دلکش محاکاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآن کا یہی اسلوب ہے جس پر (JULIAN HUXLEY) ایک جدید الہیات کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے پچھلے

سال تمہیں نیویارک ٹائمز (بابت ۲۲ ۵۲) کا ایک تراشہ بھیجا تھا جس میں ہکسلے نے کہا تھا کہ دنیا کا جدید مذہب وہ ہوگا جو انسانیت کی ارتقاء کو اپنا اصول قرار دے۔ اسی خطبہ میں اس نے کہا تھا کہ اس مذہب کو اس انداز میں پیش کیا جائے

جو ایک طرف ایسا سادہ اور سلیس ہو کہ عام انسان بھی اس سے نفع اندوز ہو سکیں اور دوسری طرف

اسقدر عمیق اور پُر معانی کہ اس سے بلند ترین مفکر بھی مطمئن ہو جائے۔

قرآن پر غور کرو۔ اس میں یہی اسلوب بیان نظر آئے گا۔ اب اس محاکاتی انداز کو دیکھو جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن، رسول سے کہتا ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ ربوبیت اور انفرادی مفاد پرستیوں کے دونوں راستے لوگوں کے سامنے رکھدو اس کے بعد ان سے کہو کہ وہ خود غور کریں اور سوچیں کہ کونسا راستہ ہمیں کس منزل کی طرف لیجاتا ہے۔ جو گروہ اپنے ذاتی مفاد کو الگ کرکے انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھے گا، اسے نظامِ ربوبیت میں جنت کا عکس نظر آئے گا۔ اس کے برعکس، جو گروہ مفاد پرستی کی نگاہوں سے دیکھے گا تو اسے اس نظام میں اپنا سب کچھ لٹتا دکھائی دے گا۔ اب دیکھو سلیم! قرآن اس حقیقت کو کس طرح بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مفاد پرست گروہ کا نمائندہ آیا

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ

اس نے سوچا۔ دونوں راستوں میں موازنہ کیا۔ پھر ایک نتیجہ پر پہنچا۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ یہ غارت ہو۔ اس نے کس قسم کا اندازہ لگایا؟ یہ کسقدر غلط نتیجہ پر پہنچا۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ توبہ۔ توبہ۔ ایسا غلط اندازہ! ایسا بُرا نتیجہ! جس سے تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ بہرحال اس نے سوچا۔ اندازہ لگایا۔ ایک نتیجے پر پہنچا۔ ثُمَّ نَظَرَ۔ پھر آنکھ اٹھا کر ادھر دیکھا۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ۔ سینے کی داخلی کشمکش کے آثار حجر کے نقشوں کی طرح اس کی پیشانی پر نمودار ہوگئے۔ اس نے تیوری چڑھائی، منہ بسورا، اور نفرت و حقارت اور غرور و تکبر کے کف بردہان جذبات سے بھرے ہوئے، پیٹھ موڑ کر چلدیا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ یوں بڑبڑاتے ہوئے کہ تیری دولت و حشمت برباد ہو جائے گی؟ یہ آسمانی فیصلے ہیں؟ یہ خدا کا قانون ہے؟ مفت میں ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ خدا — اس کا قانون — وحی۔ پرانے زمانے کی دقیانوسی باتیں۔ سب جھوٹ ہے! (فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ۔ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ)۔

مفاد پرست گروہ کا نمائندہ یوں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اور اس کے پیچھے خدا کے قانونِ مکافات نے پکار کر کہا کہ تم عنقریب دیکھو گے کہ اس کی دولت و حشمت کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ سب کچھ جھلس کر رہ جائے گا۔ نہیں، اگھل کر بہہ جائے گا۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔ یوں جھلس جائے گا کہ پھر پہچانا تک نہیں جائے گا۔ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ۔ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ۔ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۷۴)

اس تباہی و بربادی کے بعد، دنیا تحقیقاتی کمیشن بٹھائے گی کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس ہلاکت کے اسباب و علل کیا تھے؟ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو گیا۔ یہ اتنی بڑی قوتوں کے مالک اس طرح بے نام و نشان کیسے ہو گئے۔

يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ۔ (۷۴)

مجرمین سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں اس تباہی اور بربادی میں کیا چیز کھینچ لائی؟

میں محسوس کر رہا ہوں سلیم! کہ تم کسقدر بیتاب ہو یہ سننے کیلئے کہ ان مجرمین کی طرف سے اس سوال کا کیا جواب ملتا ہے؟ بات ہے بھی ایسی جس کے لئے ہر قلبِ حساس کو اس طرح بیتاب ہونا چاہئے! اتنا بڑا عظیم الشان انقلاب کس طرح واقع ہو گیا؟ اتنی بڑی قوتوں کے مالک۔ ایسی وسیع وعریض سلطنتوں کے حاکم۔ ایسی لاتعداد دولت کے خزانوں کے قارون۔ انھیں کیا ہوا کہ انقلاب کی ایک گردش میں یوں نسیاً منسیا ہو گئے کانھم لم یکن شیئاً مذکوراً۔ گویا یہ کبھی کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہ تھے! سنو سلیم! کہ ان مجرمین کی طرف سے کیا جواب ملا؟ جواب یہ ملا کہ

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (۷۴/۴۳)

کہا کہ ہم ان کے ساتھ شامل نہ ہوئے جنھوں نے نظامِ صلوٰۃ کو قائم کیا تھا۔

نظامِ صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کے متعلق میں بہت لکھ چکا ہوں لیکن قرآن نے اس تمام تفصیل کو سمٹا کر ایک فقرہ میں رکھ دیا ہے۔ یعنی

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (۷۴/۴۴)

ہم مساکین کے رزق کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔

یہ تھا وہ جرم جس کی پاداش میں ایسا انقلابِ عظیم آگیا۔ ہم مساکین کے رزق کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم باتیں بہت بنایا کرتے تھے۔ بڑی بڑی اسکیمیں۔ بڑی خوش آئند تدبیریں۔ بڑے بڑے جاذبِ نگاہ منصوبے (PLANS)۔ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ (۷۴/۴۵) بڑی بڑی مدلل بحثیں۔ بڑے بڑے بلند آہنگ ریزولیشنز۔ بڑی بڑی شگفتہ تقریریں۔ ہم یہ سب کچھ کیا کرتے تھے لیکن عملاً (وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔ ۷۴/۴۶) یہ حالت تھی کہ ہم اسے باور ہی نہیں کیا کرتے تھے کہ اس غلط معاشرے کا انجام جس میں مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں ہوتا ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں اس پر بالکل ایمان نہیں تھا۔ تا آنکہ یہ حقیقت ٹھوس شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ حَتّٰى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ (۷۴/۴۷)" اس انقلاب کے بعد یہ خود تو ایک طرف ان کے حمایتیوں کی کوئی حمایت بھی ان کے کام نہ آسکی۔ (فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۷۴/۴۸)

کچھ سمجھے سلیم! قرآن کی ان آیات کا مطلب کیا ہے؟ تم سمجھے ہو یا نہ۔ آؤ تمہیں یہ بتاؤں کہ جو لوگ اپنی عقل وفکر سے کام لیتے ہیں وہ قرآن کی ان آیات کو کس حسن وخوبی سے سمجھتے ہیں۔ امریکہ کا ایک نامور جرنلسٹ ہے (JACK BELDEN)۔ اس نے انقلابِ چین کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے (CHINA SHAKES THE WORLD) دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ مجھے اسوقت نہ تو چین کے انقلاب کے متعلق کچھ کہنا ہے اور نہ ہی اس کتاب کی بابت۔ مجھے یہ تمہیدی تعارف ایک اور مقصد کے لئے کرانا پڑا ہے۔ اس نے اس کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھا ہے کہ دنیا حیران ہے کہ یہ انقلاب واقع کس طرح ہو گیا؟ چانگ کیائی شک جیسا خاقانِ چین، اپنے حدود فراموش جیوش وعساکر اور وسعت ناآشنا ساز وبراق کے باوجود کیوں اس طرح شکست کھا گیا۔ خود امریکہ (جس نے چانگ کیائی شک کو امداد دی تھی) حیران ہے کہ چین میں ان کی سیاست کی بساط الٹ کیسے گئی۔ اس کے بعد جیک بیلڈن لکھتا ہے کہ یہ لوگ تحقیقاتی کمیشن تو بٹھاتے ہیں لیکن

نہ تو امریکہ کی حکومت۔ امریکہ کا پریس۔ نہ ہی امریکہ کے عوام اور نہ ہی ان کے نمائندے جو مشرق اقصیٰ کے کونسل خانوں میں بیٹھے ہیں نہ ہی کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی دفاتر۔ اصل حقیقت تک پہنچ سکے ہیں۔ وہ اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جا ہی نہیں سکے کہ وہ اہل چین کے کرب آگیں، پُر از جذبات قلوب کی گہرائیوں تک پہنچ سکتی۔

اس کے بعد سلیم! اس نے وہ حقیقت بیان کی ہے جس کے لئے مجھے یہ ساری تمہید اٹھانی پڑی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

ان تمام لوگوں کو (جو اس انقلاب کی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں) محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینی چاہیئے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔ (۸۹)

نہیں! (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو اس کی ترغیب نہیں دیتے تھے کہ مسکین کی روٹی کا انتظام کیا جائے۔

کچھ سُن رہے ہو سلیم! یا کھوگئے ہو اپنے تصورات کی دنیا میں؟ دیکھا تم نے کہ امریکہ کا یہ ملحد کس انداز سے قرآن سمجھا ہے؟ غور کیا تم نے کہ اس کی نگاہ کہاں پہنچی ہے؟ کتنی دفعہ خود تم نے ان آیات کو پڑھا اور کتنی مرتبہ "درس قرآن" میں انہیں قرأت کے پورے آداب اور تجوید و ترتیل کے قواعد و ضوابط کے مطابق پڑھتے ہوئے سُنا۔ کیا آج تک کسی درس میں تم نے سنا اور کسی تفسیر میں تم نے پڑھا کہ حضور رسالتمآبؐ مکہ کے تاجروں سے کیا فرمایا کرتے تھے؟ اس حقیقت تک پہنچا تو یہ غیر مسلم مصنف پہنچا! یہی وجہ تھی جو میں نے تمہیں اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ میرا اندازہ ہے کہ قرآن کو اگر سمجھیں گے تو مغرب کے مفکرین سمجھیں گے۔ ہمارے ہاں یہ صرف ایک ایک حرف سے دس دس نیکیاں حاصل کرنے اور ختم قرآن کا ثواب مردوں کو پہنچانے ہی کے کام آسکے گا۔ یا اس کام کے

کہ از لیٰسین او آساں بمیری

وہ ہمیں ہیں جن کے متعلق قرآن (سورۂ مدثر کی مندرجہ صدر آیات کے بعد) کہتا ہے کہ

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ۔ (۷۴)

انہیں کیا ہوگیا ہے کہ یہ ان حقائق سے اعراض برتتے ہیں؟

اعراض بھی ایسا کہ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ (۷۴) گویا یہ بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شیر کی آواز سُنکر بدحواس بھاگ اٹھے ہیں۔ اس طرح ہراساں اور پریشاں، لرزاں و ترساں، کہ گویا قرآن انہیں کھا جائے گا۔ ان کے سامنے اسرائیلیوں کے قصے اور کہانیاں پڑھئے۔ خوش ہو ہو کر سنیں گے۔ عجم کی وضع کردہ روایات دہرائیے، جھوم جھوم کر آپ سے ہم آہنگ ہوں گے۔ انہیں پیروں کی کرامات سنائیے، ان پر سر دھنیں گے۔ لیکن جونہی ان کے سامنے قرآن پیش کیجئے اس طرح بدحواس ہو کر بھاگیں گے کأنهم حمر مستنفرة فرت من قسورة۔ یہ سب اس لئے کہ یہ لوگ انفرادی مفاد پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً۔ (۷۴/۵۲)

ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا کاروباری پروگرام الگ ہو۔

یہ لوگ مستقبل کے مفادِ کلی کی بجائے، انفرادی مفادِ عاجلہ کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ (كَلَّا بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ...)۔ اور وہ تمام قصے کہانیاں (جسے مذہب کے مقدس لٹریچر کے نام سے پیش کیا جاتا ہے) ان کے اس پروگرام کی تائید کرتا ہے۔ برعکس اس کے قرآن انفرادی مفادِ عاجلہ کی بجائے، انسانیت کے مفادِ کلی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ قرآن سے کیوں نہ بدکیں؟ لیکن اگر یہ (مسلمان نام رکھانے والی قومیں) قرآن سے سبق حاصل نہیں کرتیں تو اس سے قرآن کا کیا بگڑتا ہے؟ قرآن کسی خاص قوم کے ساتھ وابستہ نہیں۔ كَلَّا اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ (۷۴/۵۴) یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۷۴/۵۵) دنیا کی جو قوم بھی چاہے اس سے راہ نمائی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے لئے بس ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ انسان کو چاہئے کہ اپنی فکر کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لے۔ (وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ) جو اس طرح قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے گا اسی کی زندگی ضابطۂ خداوندی کے مطابق ہوگی اور اسی کے حصے میں اس کے قانون کی حفاظت آئے گی۔ (هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۷۴/۵۶) باقی سب غیر محفوظ رہ جائیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو اس طرح غیر محفوظ رہ جائے، اس کی حفاظت کون کر سکتا ہے۔ ومالہ من نصیر۔

---

یہ ہے سلیم! منصبِ رسالت۔ یعنی نبی، حقیقتِ کلی کا یقینی علم لیکر اپنی تحیر دگاہ سے، انسانی معاشرہ کی طرف آتا ہے اور

زندگی را می کند تفسیر نو | می دہد ایں خواب را تعبیر نو
بندہا از پا کشاید بندہ را | از خداوندی رہاید بندہ را
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را | از حرم بیروں کند اصنام را

اور اس طرح دنیائے انسانیت میں وہ صالح انقلاب پیدا کر دیتا ہے جس میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہیں رہتی اور "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے"۔ جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں، نبوت کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ حقیقت کا جس قدر علم انسانوں کو دیا جانا مقصود تھا وہ قرآن کے اندر آ گیا اور قرآن قیامت تک کے لئے محفوظ ہو گیا۔ لیکن فریضۂ رسالت (یعنی قرآن کا پیغام اوروں تک پہنچانا اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کو متشکل کرنا) امتِ مسلمہ کے سپرد کر دیا گیا تاکہ یہ اسے آگے چلاتی رہے۔ اس کا ذریعہ تھا وہ نظام جسے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ سلسلہ تھوڑے دنوں تک جاری رہا اور اس کے بعد ہماری شومئی قسمت سے، گاڑی کا کانٹا بدل گیا اور وہ کسی اور ہی سمت کو چل نکلی، یہ گاڑی آج تک اسی غلط سمت کو جا رہی ہے۔ اسے صحیح پٹڑی پر لانے کے لئے "فریضۂ رسالت" کے احیاء کی ضرورت ہے۔ یعنی اسی نظام کی ازسرِنو تشکیل کی ضرورت جس کا مرکز قرآن، اور پوری کی پوری امت ہو۔ یہ وہ نظام ہے جو ایک طرف (JACK BELDEN کی مثال میں) چین، اور امریکہ کے مفاد پرستوں سے کہہ سکتا ہے کہ تمہاری ہلاکت اور بربادی کی وجہ یہ تھی کہ

تم یتیم کی تکریم نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو مسکین کی روٹی کا انتظام کرنے کی

ترغیب نہیں دیتے تھے۔

اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف، چین اور روس کے انقلابیوں سے بھی کہہ سکتا ہے کہ یاد رکھو۔ زندگی کو روٹی تک محدود سمجھ لینا بچپن ہے (وما الحیٰوۃ الدنیا الا لعب ولھو)

در مقام لا نیاساید حیات سوئے الاّ می خرامد کائنات

لا و الا سازو برگِ امتاں نفی بے اثبات مرگِ امتاں

اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے معاشی نظام کو قرآنی ضوابط کے تابع رکھا جائے۔ اسکی شادابی اور پائندگی کی یہی صورت ہے۔

گر جہاں داند حرامش را حرام تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

لیکن سلیم یہ کام ہمارے "مُلّاؤں اور عاموں" کے بس کا نہیں۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر!

یہ کچھ ان کے ہاتھوں ہوگا جو قرآن کی روشنی میں عقلِ خداداد سے کام لیں گے۔ تم سلیم! مفکرین مغرب کے جدید افکار کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ وہ قرآن کے قریب آنے کے لئے کس طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:

> اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں: ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کیلئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ (پیام مشرق)

اس "نئے آدم" کی تخلیق کا امکان مسلمانوں کے ہاں تو نظر نہیں آتا۔ ان کے رگ و پے پر وہ عجمیت شدت سے مسلط ہے جس کا اندیشہ اقبال نے ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا۔

> اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آجائے جو جذباتِ قلب کو افکارِ دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی۔

دیکھنا یہ ہے کہ اس "نئے آدم" کے ظہور کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصے میں آتی ہے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے مسکین دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

لیکن دیکھنا! "نئے آدم" کے الفاظ سے کہیں تم بھی کسی "مسیح موعود" اور "مہدی" اور "مجدد" کا تصور لیکر نہ بیٹھ جانا۔ "نئے آدم" سے مراد ہے وہ انسان جو خدا کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون کی اطاعت گوارا نہ کرے۔ اسی قسم کے انسانوں کی تشکیل فریضۂ رسالت ہوتا ہے۔

اچھا۔ خدا حافظ۔

پرویز

# اقبالؒ کا پاکستان

اسوقت پاکستان کے مستقبل کا مسئلہ زیر غور ہے۔ ہر طرف سے مختلف قسم کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ پاکستان کا تصور حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا نتیجہ تھا اس لئے وہی بتا سکتے تھے کہ اس خاکے میں کس قسم کا رنگ بھرا جائیگا۔ پاکستان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ اقبال کی قیادت سے محروم رہ گیا۔ اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو وہ اپنے تصور کو، قرآن کی روشنی میں عملی شکل عطا کر دیتے۔

ہرچند ہم میں آج اقبال موجود نہیں لیکن اقبال کی فکر ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس فکر کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک پاکستان کی اسلامی مملکت کا نقشہ کیا ہونا چاہیئے تھا۔ ذیل میں ہم، فکرِ اقبال کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک ترتیب سے پیش کرتے ہیں تاکہ یہ ہمارے لئے نشاناتِ راہ کا کام دے سکیں۔ ان میں سے کئی چیزیں اس سے پیشتر قارئینِ طلوعِ اسلام کے سامنے آچکی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جتنی بار سامنے آئیں ان کی افادی حیثیت بڑھتی جاتی ہے۔ دیکھئے کہ اقبال کے نزدیک اس نقشے کے خطوط کیا تھے۔

---

## قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں!

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبال سے پوچھا کہ "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے۔" انھوں نے فرمایا "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں، ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشاء دریافت کرنے کیلئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔" (البیان۔ دسمبر ۱۹۲۹ء)

---

## مقامِ حدیث

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے، کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر

حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کردے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کرلیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی انھیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات اقبال ص ۱۶۲-۱۶۳)

---

## احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو ان[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کرکے ان کو الگ کر دیا ہے اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لئے باعث برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرضکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر

---

[1] مولانا خواجہ احمد الدین صاحب۔

مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سُن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمالؑ کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعۃ القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (مکتوب بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

---

## مسلمانوں کا نصب العین

الفاظ شرف انسانی کے متعلق کسی کو دھوکہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جو حضرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشا رالٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمت للعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شھداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔ (حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ متعلقہ قومیت)

---

## اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

(۱) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوع کی حیثیت سے انھیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوو ارتقا ہے۔ نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم سمجھ لیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے: تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب ــــ متعلقہ "فلسفۂ سخت کوشی")

(۲)

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا جیسے مصریوں یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیوٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی نہ پرائیوٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو

متحد و منظم کرتا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومی نے

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ رہ کر جو در راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہو گی اور شرفِ انسانیت کے خلاف ہو گی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسا اساس نہ بن سکتی تھی۔ انھوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کے اساسِ انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصولِ دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں؟ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(حسین احمد مدنی کے جواب میں ــــ مضمون متعلقہ وطنیت)

(۳)

نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو اُن تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے تک، معلوم نہیں، حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی منافرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی، اور لسانی امتیازات کے ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے، وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے۔ بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں ــــ مضمون متعلقہ وطنیت)

---

## عالمگیر پیغام کیلئے بھی ایک سوسائیٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبارِ اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں

عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولیں نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو۔ لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب —— متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

(۳)

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے آثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسنِ معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب —— متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

## مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں، لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبارِ آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی ارادت محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے، جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق محض صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو۔ لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولیں نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس کے

معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ (خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

(۲)

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

## اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے۔ (بجواب حسین احمد مدنی — متعلقہ قومیت)

(۲)

امت مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی متقوم ہے۔ اس گروہ کے امور معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظِ دیگر یہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

## ملائیت، تصوف، ملوکیت

۱ — ملائیت:۔ علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں۔ لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوال بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزادرائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین کے لئے حوصلہ افروز تھی، درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اسی جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲ — تصوف:۔ مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے عوام کی

قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ ملوکیت:۔ مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔ (ختم نبوت — بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

---

## پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

---

## اسلام ایک طرح کی سوشلزم ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

(مکتوب بنام غلام السیدین - محررہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

---

## یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمایندگی کرے۔ یا وہ عوام کی نمایندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں، امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما (Development) دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (Subsistance) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

(مکتوب بنام قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ۔ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

---

## اشتراکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بتن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

---

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ　　بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں　　از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است　　تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ　　لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند　　مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں　　خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات　　سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا سازو برگِ امتاں　　نفی بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل　　تا نگردد لا سوئے الا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن　　نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
اے کہ می بینی نیرزد با دو جو　　از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا است
جملہ موجودات را فرمانروا است

---

## الارض للہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر　　رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
صحبتش تا کے تو بود و او نبود　　تو وجود و او نمودِ بے وجود
تو عقابی طائفِ افلاک شو　　بال و پر بکشا و پاک از خاک شو
باطنِ الارض للہ ظاہر است　　ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
من نگویم در گذر از کاخ و کوے　　دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بو

دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر      صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بکہسارش بزن      نورے از خود گیر و بر نارش بزن
از طریق آزری بیگانہ باش      بر مراد خود جہانِ نو تراش

دل برنگ و بوئے و کاخ و کو مدہ
دل حریم اوست جز با او مدہ

---

رزق خود را از زمیں بردن رواست      ایں متاع بندہ و ملک خداست
بندہ مومن امیں حق مالک است      غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایت حق از ملوک آمد نگوں      قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں

آب و نان ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

---

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست      مرد ناداں ایں ہمہ ملک خداست
ارضِ حق را ارض خود دانی بگو      چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا؟
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد      من زابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکار خود نبرد      اے خوش آں کو ملک حق با حق سپرد
بردہ چیزے کہ از آن تو نیست      داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست
گو تو باشی صاحبِ شے می سزد      ور نباشی، خود بگو کے می سزد
ملک یزداں را بہ یزداں باز دہ      تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیر گردوں فقر و مسکینی چراست      آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست
بندۂ کز آب و گل بیروں نجست      شیشۂ خود را بسنگ خود شکست
اے کہ منزل را نمی دانی ز رہ      قیمتِ ہر شے ز انداز نگہ
تا متاعِ تست گوہر گوہر است      ورنہ سنگ است از شررے کمتر است

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

## قرآن کا مثالی معاشرہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش  خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب  رازدانِ کیمیائے آفتاب
خدمت آمد مقصد علم و ہنر  کارہا را کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست  ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
سخت کش دہقاں، چراغش روشن است  از نہاب دہ خدایاں امین است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجوست  حاصلش بے شرکتِ غیرے ازدست
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں  نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم درمرغدیں گیرد فروغ  از فنِ تحریر و تشہیرِ فروغ
نے ببازاراں ز بیکاراں خراش  نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

---

## حاصلِ مملکتِ اسلامیہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

---

## ابلیس کی زبان سے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں  ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں  بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف  ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر  حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے | نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف | منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب | بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب | یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

---

یہ ہے اقبال (اور قرآن) کے مطابق پاکستان کا صحیح نقشہ اور اسی کے مطابق ہونا چاہیئے اس کا دستور۔

---

# معراجِ انسانیت

(معارف القرآن۔ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینے میں۔
فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پورے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبحِ بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

**ادارہ طلوعِ اسلام۔ بندر روڈ۔ چوک سول ہسپتال۔ کراچی**

# باب المراسلات

## زکوٰۃ وصدقات

جناب بشیر احمد صاحب سوی جالندھری لکھتے ہیں :-

زکوٰۃ کے متعلق بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس کا مفہوم قرآن مجید سے سمجھنے کی بجائے احادیث سے اخذ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں دو حکم الگ الگ ملتے ہیں۔ ایک زکوٰۃ کا اور دوسرا صدقہ کا۔ قرآن میں زکوٰۃ کے متعلق ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ (بقرہ) الذین للزکوٰۃ فاعلون (المومنون) اور صدقات کے متعلق ہے خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا (توبہ) مگر فقہاء کہتے ہیں کہ زکوٰۃ وصدقات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ سیرۃ النبی زمانہ موجودہ کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کے جلد پنجم کے بابِ زکوٰۃ میں مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں "زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے" (ص۲۰۱) پھر اس کے بعد اس بابِ زکوٰۃ میں جو فروعی احکام وتفصیلات بیان فرماتے ہیں وہ سب صدقہ کے متعلق ہیں مگر منسوب زکوٰۃ کی طرف ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ صدقہ اور زکوٰۃ دونوں کا تعلق انفاقِ مال سے ہے۔ اور اس مشارکت کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ احکام جب دو مقام پر الگ الگ بیان ہوں تو ان کو ایک ہی حکم کے دو نام سمجھ لیا جائے۔ مگر جب ایک ہی آیت میں دونوں حکموں کا بیان ہو تو ان کے دو الگ الگ حکم ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ میں ایسے ہی چند مقامات قرآن مجید سے پیش کرتا ہوں تاکہ مطلب واضح ہو جائے :-

(۱) یاایھا الذین اٰمنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی نجوٰکم صدقۃ ذالک خیر لکم واطہر فان لم تجدوا فان اللہ غفور رحیم ء اشفقتم ان تقدموا بین یدی نجوٰکم صدقٰت فاذ لم تفعلوا وتاب اللہ علیکم فاقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واطیعوا اللہ ورسولہ واللہ خبیر بما تعملون ۰ (المجادلہ)

اے ایمان والو جب تم رسول سے سرگوشی (کرنے کا ارادہ) کیا کرو تو اپنی اس سرگوشی سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور (گناہوں سے) پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے پھر اگر تم کو (صدقہ دینے کی) مقدور نہ ہو تو اللہ غفور رحیم ہے کیا تم اپنی سرگوشی کے قبل خیرات دینے سے ڈر گئے؟ سو (اخیر) جب تم (اس کو) نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے حال پر عنایت فرمائی تو تم نماز کے پابند رہو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور رسول کا کہنا مانا کرو اور اللہ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے۔ (ترجمہ تھانوی)

ان آیات سے صدقہ اور زکوٰۃ کا فرق اور زکوٰۃ کی صدقہ پر فوقیت واضح ہے۔ صدقہ رضاکارانہ فعل ہو سکتا ہے مگر دو بنیادی حقیقتیں اور دائمی صداقتیں جن پر ہر حالت میں لگے رہنے کا حکم ہے الصلوٰۃ، الزکوٰۃ اور اطاعت اللہ ورسول ہیں۔

زکوٰۃ اور صدقہ کے فرق کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ اس جگہ اس بات کو ثابت کرنا مقصود ہے کہ زکوٰۃ اور صدقہ دو الگ

الگ حکم ہیں اور ان کے فروعی احکامات بھی الگ الگ ہیں۔

(۳) لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ و الکتٰب والنبیین ج واٰتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والمسٰکین وابن السبیل والسآئلین وفی الرقاب ج واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عٰھدوا ج والصٰبرین فی البأسآء والضرآء وحین البأس ط اولٰئک ھم المتقون۔ (بقرہ)

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (سب) کتب (سماویہ) پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو ........ (ترجمہ تھانوی)

یہ آیت قرآن مجید کی محکم آیات میں سے ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے رسمی اور اصلی نیکیوں میں فرق کرکے موخرالذکر کو اصل دین اور انسانی کردار کا بلند ترین مقام ٹھہرایا ہے۔ اس آیت میں ہر نیکی اپنی جگہ مستقل ہے کوئی نیکی ایک دوسرے کی مرادف نہیں۔ اس میں صدقات اور زکوٰۃ دو مستقل نیکیاں شمار کی گئی ہیں اگرچہ صدقہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا مگر اس کی مدات کو بیان کر دیا گیا ہے (واٰتی المال ــ تا ــ فی الرقاب) سورۂ توبہ کے رکوع آٹھ کی مشہور آیت انما الصدقات للفقراء الخ جو تقسیم صدقات (اور بقول علماء زکوٰۃ) کے لئے نص خیال کی جاتی ہے، میں جن آٹھ مدات کا ذکر ہے وہ مدات اصولاً اس آیت بِرّ (لیس البر الخ) میں بھی مذکور ہیں۔ بظاہر ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والسائلین کا صدقات کی آیت (انما الصدقت للفقراء) میں ذکر نہیں ہے مگر ان لوگوں کا مستحق صدقات ہونا مسلم ہے اور قرآن مجید میں کئی جگہ ان کو مستحق صدقات قرار دیا گیا ہے مثلاً قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتٰمیٰ والمسٰکین وابن السبیل (بقرہ) اور ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا (دہر) اور فاما الیتیم فلا تقھر واما السائل فلا تنھر (ضحیٰ) نیز والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (معارج) حقیقت میں یہ تمام مستحقین صدقات ہیں اور یہ انفاق فی سبیل اللہ کی جامع اصطلاح میں شامل ہے۔ فقہاء بھی ان کو مستحقین صدقات ہی لکھتے ہیں۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی صاحب نے مذکورہ بالا کتاب کے باب زکوٰۃ کے ص ۲۴۲ پر لکھا ہے:-

> مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجتمند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا۔

آیت بِرّ میں العاملین علیھا (صدقات کے صیغہ میں کام کرنے والے) اور مؤلفۃ قلوبھم (اسلام کی طرف مائل) اور الغارمین (تاوان بھرنے والے) لوگوں کا ذکر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ حقیقی مستحقین صدقات نہیں، ان کا استحقاق اعتباری ہے نہ کہ حقیقی۔ جیسے حالات ویسا ان کے متعلق حکم۔ غرض صدقہ کا حکم بحیثیت اصلی نیکی کے آیت بِرّ میں بالوضاحت بیان ہوگیا ہے اور اس کے بعد الصلوٰۃ اور زکوٰۃ

کے حکم مستقل نیکیوں کے طور پر اپنی جگہ قائم رکھے گئے ہیں۔

(۳) قرآن مجید میں ایک اور آیت میں زکوٰۃ اور صدقہ کو دو الگ الگ حکموں کی صورت میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقت واللہ لا یحب کل کفار اثیم ۔ ان الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحت واقاموا الصلوۃ واٰتوا الزکوۃ لھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقرہ)

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو (اور) کسی گناہ کرنے والے کو بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی ان کیلئے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔ (ترجمہ تھانویؒ)

اس آیت میں سود خوار کو سود کے ترک اور صدقہ کی ترغیب ہے۔ سود کا چھوڑ دینا بھی ایک صورت صدقہ کی ہے۔ آیت توبہ (انما الصدقت الخ) میں وفی الرقاب سے وہ مقروض بھی مراد ہیں جو اپنا قرض خود کسی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ ایسے اشخاص کی گلو خلاصی کرنا صدقہ ہے۔ صدقہ کے حکم کے بعد ایتائے زکوٰۃ کا حکم الگ فرمایا۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ حکم ہیں۔

(۴) قرآن مجید میں کئی جگہ زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ قرض حسنہ دینے کا حکم آیا ہے:

واقیموا الصلوۃ واٰتوا الزکوۃ واقرضوا اللہ قرضا حسنا (پ ۲۹)

نظام صلوٰۃ کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض حسن دو۔

اس آیت میں قرضِ حسنہ اور زکوٰۃ کے الگ الگ دو حکم ہیں۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ ضرورتمندوں کو صدقات کی رقوم سے قرض بھی دیا جاتا تھا اس لحاظ سے ان آیات کا مطلب یہ ہوا کہ "صدقہ دو" اور "زکوٰۃ دو"۔

اوپر کی تشریحات سے واضح ہوگیا کہ زکوٰۃ اور صدقات دو الگ الگ حکم ہیں اور ان کو ایک دوسرے کے مرادف سمجھنا اور یہ کہنا کہ "زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے" قرآن حکیم میں معنوی تحریف اور دو میں سے ایک حکم (زکوٰۃ) کا انکار اور ترک ہے۔ افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

قرآنِ مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے دین ایک ہی ہے اور اسلام اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے۔ وہ نوع انسانی کے لئے ایک ہی پیغام لائے۔ قرآن کی تعلیمات کے مطابق بنی اسرائیل کو بھی صدقات اور زکوٰۃ دونوں کے احکام دیئے گئے تھے۔ واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا وذی القربی والیتٰمی والمسٰکین وقولوا للناس حسنا واقیموا الصلوۃ واٰتوا الزکوۃ ثم تولیتم الا قلیلا منکم وانتم معرضون۔ (بقرہ) آیت برّ (لیس البر الخ) کی طرح یہاں بھی صدقات کا ذکر فرمایا گیا اور زکوٰۃ کا حکم بھی دیا گیا ہے دوسری جگہ فرمایا۔ ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوۃ واٰتیتم الزکوۃ واٰمنتم برسلی وعزرتموھم واقرضتم اللہ قرضا حسنا لاکفرن عنکم سیاتکم (بقرہ)

حسب تشریح سابق یہاں بھی زکوٰۃ اور صدقات (اقرضتم اللہ قرضاً حسناً) کے دو حکم دیئے گئے تھے۔

یہود نے بھی ان احکام کو بدل دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں یا مسلمان یا کوئی اور قوم، مذاہب کی تاریخ کا عبرتناک سبق یہی ہے کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد انسانوں پر غفلت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اعمال میں سہل انگاری اور احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں فبما نقضھم میثاقھم لعنّٰھم وجعلنا قلوبھم قٰسیۃ یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظاً مما ذکروا بہ

یہ آیت جس طرح یہودیوں پر صادق آتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں پر بھی۔

**طلوع اسلام** | طلوع اسلام بابت اکتوبر ۵۰ء میں محترم پرویز صاحب کا ایک مضمون شائع ہو چکا ہے جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ زکوٰۃ اور صدقات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ زکوٰۃ سے مراد ہے اسلامی حکومت کی وہ تمام آمدنی جو افراد ملت کی نشوونما (تزکیہ) کا موجب بنتی ہے اور صدقات سے مراد ہے وہ خصوصی امداد جو کسی ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے افراد ملت سے طلب کی جاتی ہے۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لئے اس مضمون کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

---

## ۲۔ قوموں پر عذاب کی شکلیں

میرے ایک صاحب فکر اور صاحب قلم کرم فرما رقمطراز ہیں:-

اے محترم! میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کے عہد میں پیدا ہوا اور آپ کے تعارف کا شرف حاصل کر سکا، ورنہ کیا خبر کہ کفر و الحاد کے کس عمیق ترین گڑھے میں شک و انکار کے بھاری پتھروں کے نیچے دبا ہوا ہوتا۔ آپ کے خطوط کی ضیا پاشیوں نے میرے ذہن و دماغ کے تاریک ترین گوشوں کو رشک شب چہار دہم بنا دیا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہتی جب میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھے ایک ایسی جامع العلوم ہستی سے تخاطب کی سعادت حاصل ہے، جس کا دامن ملائیت کی گرد سے بالکل پاک ہے۔ جس کے ہاں اظہار اختلاف اور وضاحت طلبی نہ موجب تکفیر ہے نہ قابل دار۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

گزشتہ جنوری میں سلیم کے نام آپ نے جو الطاف نامہ (زیادہ صحیح یوں کہ حقائق نامہ) تحریر فرمایا ہے، سابقہ خطوط کی طرح اس نے میرے بہت سے شبہات زائل کئے اور بہت سے نئے نکتے سکھائے۔ خصوصاً "والنجم اذا ھویٰ" پر آپ نے جو روشنی ڈالی ہے اور "النجم" کو آیات مابعد کے ساتھ جو تطبیق دی ہے وہ تیرہ صدیوں کی تفسیری تاریخ میں ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ ہمارے بزرگ مفسرین نے آجتک ان آیات کو ابہام و تصوف کی چیستان بنا رکھا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ زمین پر تو اس کا مطلب حل نہیں ہوتا تو آسمان کی پرواز شروع کر دی۔ اب نہ کوئی آسمان پر جا کر واپس آئے اور نہ ان کی غلطی پکڑ سکے اور انکار کرے تو کافر۔

اسی نامہ گرامی میں بعض سطور ایسی بھی نظر سے گزریں جن کے متعلق مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سر دست صرف ایک مقام کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں، ممکن ہو تو آئندہ خط میں ان پر تفصیلی نظر ڈالیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ

> امم سابقہ پر انکار صداقت کی پاداش میں عذاب طبعی (PHYSICAL) شکل میں آیا کرتا تھا، آندھیاں، زلزلے، سیلاب وغیرہ۔ لیکن نزول قرآن کے بعد قوموں کے اعمال کے نتائج ان کے عروج و زوال کی شکل میں سامنے آنے لگے۔

آپ نے دو باتیں فرمائی ہیں۔

۱ــــ عذاب بشکل طبعی زمانہ قبل قرآن سے مخصوص تھا۔

۲ــــ عذاب بشکل عروج وزوال زمانہ بعد قرآن کے لئے مخصوص ہے۔

تاریخ عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں عذاب طبعی کے ساتھ عروج وزوال کا عذاب بھی آتا رہا ہے۔ آپ اس سے یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے اس لئے شواہد کی ضرورت نہیں۔ اب رہی دوسری بات کہ "نزول قرآن کے بعد صرف عروج وزوال کا عذاب باقی رہ گیا ہے اور طبعی عذاب آندھیاں، زلزلے، سیلاب وغیرہ کا تعلق قوموں کے اعمال کے نتائج سے نہیں رہا۔ یہ نظریہ محل نظر ہے۔ کیونکہ قوموں کی بداعمالیاں اب بھی موجود ہیں اور یہ طبعی حوادث بھی رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک خالص مادی آدمی بہت سے دلائل کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ان کا اعمالِ اقوام سے کوئی تعلق نہیں۔ اور ایک خالص مذہبی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان کا ظہور انسانی اعمال سے وابستہ ہے، دلائل وہ بھی کچھ نہ کچھ دے ہی سکتا ہے۔ میں اور آپ خدا کے فضل سے نہ تو مادیات کو نظرانداز کر سکتے ہیں (کیونکہ یہ بھی تو اللہ ہی کی چیزیں ہیں) اور نہ ہی قرآن سے صرف نظر کرنا جائز سمجھتے ہیں (اس لئے کہ یہ خدا کا قانون ہے) اس لئے ہمیں دونوں پہلوؤں کو متوازن رکھ کر سمجھنا ہوگا، اور آپ تو بفضلہٖ پہلے سے اس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اسلوب اعتدال وتوازن آپ ہی سے سیکھا ہے۔ فجزاکم اللہ

آج ہی کا ذکر ہے کہ میں ظہر کے بعد سورۂ "اعراف" کو دیکھ رہا تھا، اس میں مختلف اقوام اور ان کے اعمال وسزائے اعمال کا ذکر سامنے آگیا، اس موقع پر مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ آپ نے کوئی بامحاورہ اور محشّی ترجمہ قرآن کیا ہوتا تو بہت سے نکتے گھر بیٹھے ہی حل ہو جاتے اور آپ کو بار بار تکلیف دینے کی ضرورت پیش نہ آتی ــــ اب سنئے میرے تاثرات جو آپ کے نامۂ گرامی کی مذکورہ بالا سطور اور اس سورہ کے مطالعے سے پیدا ہوئے۔

سب سے پہلے نوح علیہ السلام کا ذکر ہے جو ختم ہوتا ہے اس آیت پر

"ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا، جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا"

اس کے بعد ہود علیہ السلام کا بیان ہے جس کا خاتمہ حسب ذیل ہے۔

"ہم نے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔

پھر صالح اور شعیب علیہما السلام کا تذکرہ ہے۔ ان کے مخاطبین کا انجام یہ ہے کہ

ان کو رجفہ (بھونچال) نے آپکڑا۔

ان دونوں بزرگوں کے درمیان لوط علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ ان کے مخالفوں کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:۔

ہم نے ان پر ایک بارش برسائی، پھر دیکھو ان مجرموں کا انجام کیا ہوا؟

یہ پانچ قومیں ہیں اور آپ کی تعبیر صحیح کے مطابق ان کو طبعی عذاب کی سزا ملی۔ اس سلسلہ بیان کے بعد فرماتے ہیں کہ

اگر بستیوں کے باشندے ایمان وتقویٰ اختیار کرتے تو ہم زمین وآسمان کی برکتیں ان کے لئے فراخ کر دیتے، لیکن انھوں نے جھٹلایا اور ہم نے ان کے کرتوت کے سبب گرفتارِ عذاب کیا۔ کیا بستیوں کے باشندے ایسے نڈر ہوگئے کہ ان کو ہمارا عذاب راتوں رات آپہنچے اور وہ سوتے ہوئے ہوں — اور کیا اہل بلاد بے خوف ہوگئے کہ دن کو ہمارا عذاب انھیں آلے اور وہ کھیل میں مگن ہوں۔

ان آیات سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبعی برکات بارش، ہوا، اناج وغیرہ کا تعلق ایمان وتقویٰ سے ہے اور طبعی عذاب، زلزلہ، سیلاب وغیرہ کا باعث تکذیب اور دوسرے انسانی اعمال (بما کانوا یکسبون) ہیں۔ اور اس میں کسی خاص عہد کی قید نہیں کہ پہلے ہوتا تھا اور اب نہیں ہوگا۔

اب جو میں نے اور زیادہ سوچا تو میرے خیال میں بعض دوسری آیات بھی آئیں جو میرے اس شبہ کی موید ہیں۔ (یہ شبہ جو آپ کی مذکورہ بالا سطور سے پیدا ہوا)۔ مثلاً سورۂ فاطر میں ہے :-

برا مکر خود اہلِ مکر ہی کو گھیر لیتا ہے، پھر یہ (مکی) لوگ اگلے زمانے والوں ہی کی پاداش کی روش کے منتظر ہیں۔ اور اللہ کی روش میں تم کوئی تبدیل وتحویل نہیں پاؤ گے۔

یعنی جیسے طبعی عذاب یا قومی زوال کی سزا اگلوں کو ملی زمانہ قرآن کے مکذبین کو بھی ملے گی اور یہ ایک ایسا قانون ہے جو اٹل ہے سورۂ انعام میں ہے :-

اللہ قادر ہے اس پر کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں تلے سے یا تم کو آپس میں بھڑا دے۔

یہ تین عذاب ہیں۔ ان میں سے پہلے دو طبعی سمجھے جاتے ہیں اور یہ عام ہیں۔ کسی زمانے سے مختص نہیں۔ سورہ "ملک" کے آخر میں ہے۔

کہہ دے، خیال تو کرو۔ اگر تم پانی سے محروم کر دیئے جاؤ، تو پھر کون ہے جو تمہیں خوش گوار پانی لا کر دے۔

یہ بھی میرے شبہ کی تائید ہے۔

محترم! میں کوئی مضمون نگاری تو کر نہیں رہا کہ خواہ مخواہ بات کو طول دوں۔ آپ اس مختصر گزارش سے میرے مفہوم کو بہ تمام وکمال سمجھ گئے ہوں گے۔ میں نے آیات کے الفاظ اور باقاعدہ حوالے نقل نہیں کئے، اس لئے کہ یہ اور اس مفہوم کی اور بہت سی آیات پہلے سے آپ کے سامنے ہوں گی، اگر آپ اس عریضے کو "طلوعِ اسلام" میں چھپنے کے لئے بھیج دیں اور آیات کے نمبر لگوا دیں تو اس کے جواب سے جو آپ دیں گے بہت سے ایسے دوستوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے جو مروجہ تراجم قرآن کی بنا پر میری طرح اس شبہ میں گرفتار ہوئے ہوں گے۔ والسلام مع الاکرام۔

**طلوعِ اسلام** میں اپنے واجب الاحترام کرمفرما (جن کے خلوص اور محبت کی میرے دل میں خاص قدر ہے) بدل شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ان نکات کی وضاحت اس انداز سے طلب فرمائی۔

جہاں تک قرآن سے میں سمجھ سکا ہوں قوموں کے عروج وزوال سے متعلق ایک واضح قرآنی اصول تو یہ ہے کہ جو قوم اپنے

معاشرہ کو قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل کرلیتی ہے وہ قانونِ خداوندی کے ثمرات سے مالامال ہوجاتی ہے۔ اسے زندگی کی خوشگواریاں اور مرفہ الحالیاں نصیب ہوجاتی ہیں۔ ان کا حال بھی تابندہ ہوتا ہے اور مستقبل بھی درخشندہ۔ ان کے برعکس جو قومیں اپنے معاشرہ کو اپنے خودساختہ آئین کے تابع رکھتی ہیں اور اسی طرح ضوابطِ خداوندی سے اعراض برتتی ہیں ان کے معاشرہ میں فساد رونما ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قوموں کے عروج وزوال کا یہ ابدی قانون شروع سے آج تک مسلسل چلا آتا ہے۔ زمانۂ قبل از قرآن میں بھی یہی قانون نافذ تھا اور آج بھی قوموں کی تقدیروں کے فیصلے اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔

لیکن قوموں کی سزا کی ایک اور شکل بھی قرآن میں آئی ہے اور یہ وہ شکل ہے جسے میں نے طبعی عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کسی قوم کا بارش کے سیلاب، آندھی کے طوفان، بھونچال کے جھٹکے اور کوہ آتش فشاں کی شرربار یوں سے ہلاک ہوجانا۔ جہانتک میں سمجھ سکا ہوں عذاب کی یہ شکل زمانہ قبل از قرآن تک محدود رہی ہے اس کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اور قوموں کے عروج وزوال کا وہ پہلا اصول کارفرما رہا جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج بھی آندھیاں آتی ہیں، بارشیں ہوتی ہیں، زلزلے آتے ہیں اور آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں، وبائیں پھیلتی ہیں، اور ٹڈی دل کی یورشیں بھی ہوتی ہیں۔ ان سے قوموں کے نقصانات بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں اور زمانۂ قبل از قرآن کے اسی قسم کے حوادث میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس زمانہ میں خدا کا رسول اپنی قوم کو قبل از وقت آگاہ کرتا تھا کہ تم فلاں فلاں جرائم سے باز آجاؤ، ورنہ سیلاب یا آندھی یا آتش فشانی کے عذاب سے ہلاک ہوجاؤ گے۔ وہ قوم اس تنذیر سے اعراض برتتی، اس کے بعد وہ رسول مومنین کی جماعت کو ساتھ لیکر قبل از وقت الگ ہوجاتا اور فاسقین کی قوم موعودہ عذاب سے تباہ ہوجاتی۔ قرآن میں جہاں ان اقوام کی اس قسم کی ہلاکت کا ذکر آیا ہے اس کے ساتھ ہی اس کی صراحت بھی موجود ہے کہ ہم نے مومنین کی جماعت کو اس سے محفوظ رکھا۔

قرآن کے ساتھ حسی معجزات کا دور ختم ہوگیا۔ طبعی حوادث کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ لیکن اب یہ حوادث نہ تو کسی رسول کی وعید کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور نہ ہی مومن اور فاسق میں کوئی فرق کرتے ہیں۔ اب اگر کہیں زلزلہ آتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس خطہ کے لوگوں نے خاص طور پر قانونِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور دنیا کے باقی خطے جہاں وہ زلزلہ نہیں آیا مومنانہ زندگی بسر کرتے تھے نہ ہی ایسی صورت ہوتی ہے کہ اس زلزلہ سے صرف بدکار لوگ مرتے ہیں اور نیکوکار محفوظ رہتے ہیں۔ وہ زلزلہ طبعی قوانین کے مطابق ظہور میں آتا ہے اور جو اس کی زد میں آجائے ہلاک ہوجاتا ہے۔ اگر اب بھی جرائم کی سزائیں طبعی حوادث کے ذریعہ ملتیں تو میرا خیال ہے (اور آپ بھی یقیناً اس سے متفق ہوں گے) کہ دنیا کی ساری آبادی کبھی کی غرق ہوچکی ہوتی۔ آج کونسا خطۂ زمین ہے جہاں قانونِ خداوندی کی علانیہ تکذیب نہیں ہورہی۔ میرا خیال ہے کہ ان اشارات سے سورۂ اعراف کی ان آیات کا مطلب واضح ہوگیا ہوگا جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے

اب لیجئے وہ باقی دو تین آیات جن کی طرف آپ نے متوجہ کیا ہے سورۂ فاطر کی محولہ صدر آیت میں ارشاد ہے۔

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (۳۵/۴۳)

ناہموار تدبیریں کرنیوالوں کی تدبیروں کا وبال خود انہی کے اوپر پڑتا ہے۔

خود یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہ عذاب طبعی حوادث کی شکل میں نہیں آتا۔ بات بالکل واضح ہے کہ جو معاشرہ ناہموار خطوط پر تشکل ہوتا ہے وہ خود ان ناہمواریوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہ وہ سنت ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

سورۂ "ملک" کی آیت یہ ہے:۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ (۶۷/۳۰)

ان سے کہو کہ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر پانی زمین کی ترائی میں اتر جائے تو تمہارے چشموں سے نہریں کیسے جاری ہوں۔

اس آیت میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی کسی حد تک تفصیل اس خط میں بیان کر چکا ہوں جو دسمبر ۱۹۵۲ء کے طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے اس میں دیکھا ہوگا کہ قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے۔ ذرا سوچو کہ اس میں تمہاری ہنرمندی کا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارے قوانین اس میں کیا کچھ کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد قرآن اس نتیجہ کو سامنے لاتا ہے کہ تم تمام پیداوار کے واحد مالک کس طرح بن سکتے ہو۔ وہاں (سورہ الواقعہ میں) ہے:۔

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ . . . . . . . . لَوْ نَشَاءُ
جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ (۵۶/۶۹-۷۰)

کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا جسے تم پیتے ہو۔ اگر ہم اس پانی کو کھاری بنا دیتے تو تمہاری ہنرمندی اس میں کیا کرتی۔ پھر تم خدا کی اس بخشائش کو اس کے صحیح مقام میں صرف کیوں نہیں کرتے۔

یہی وہ چیز ہے جسے سورۂ "ملک" کی مندرجہ بالا آیت میں یہ کہہ کر بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ پانی جس پر تمہاری کھیتوں کا دارومدار ہے زمین کے اوپر نہ آتا تو تم کیا کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ اس میں جرائم کی پاداش میں طبعی عذاب کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

اب سورۂ انعام کی اس آیت کو لیجئے جس سے آپ کو شبہ ہوا ہے کہ اس میں طبعی عذاب کا ذکر ہے۔ آیت یوں ہے:۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا

وَيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ (٦/٦٥)

اُن سے کہدو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب پیدا کردے یا نیچے سے یا مخلوط طور پر تمہیں پارٹیوں میں تقسیم کردے اور پھر یہ پارٹیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں۔ ذرا غور کرو ہم کس طرح اپنے قوانین کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ حقیقت کو سمجھ سکیں۔

بات بالکل صاف ہے یہاں کسی قوم کی تباہی کے تین مختلف طریقے بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ قوم کا طبقۂ اعلیٰ ظلم و استبداد شروع کردے اور اس طرح نیچے کا طبقہ کچلا جائے اور کچھ عرصہ کے بعد نہ اوپر کا طبقہ باقی رہے نہ نیچے کا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قوم کا نیچے کا طبقہ فساد انگیزیاں شروع کردے اور اس طرح معاشرہ میں بدنظمی پیدا ہو کر تباہی کا موجب بن جائے۔ اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کی پارٹیاں بنیں جس میں اوپر اور نیچے کے طبقات مخلوط طور پر شامل ہوں (جیسا کہ لَبْس سے واضح ہے) اس طرح یہ پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالفت سے ساری قوم کو برباد کردیتی ہیں۔ اگر غور کیجئے تو قرآن کے اس بیان میں ایک خاص ترتیب بھی ہے۔ پہلے اوپر کا طبقہ قوم کو استبدادی شکنجہ میں کستا ہے جب ان کی گرفت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو نیچے کا طبقہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ شکاری قسم کے لوگ اس صورتِ حال کو (EXPLOIT) کرتے ہیں اور اس طرح قوم پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے اس سے خانہ جنگی شروع ہوتی ہے جس کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ عذاب جس کی طرف قرآن نے مندرجہ بالا آیت میں اشارہ کیا ہے۔

میں نے اس مقام پر صرف اشارات کو کافی سمجھا ہے۔ ان تمام امور کی تفصیل میری زیرِ تسوید تصنیف "قرآنی نظامِ ربوبیت" میں ملے گی جس میں میں نے بتایا ہے کہ صحیح خطوط پر متشکل معاشرہ کس طرح زمین و آسمان کی برکات سے متمتع ہوتا ہے اور اس کے برعکس ناہمواریاں پیدا کرنے والا معاشرہ کس جہنم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ قرآن کی وہ تمام آیات جو معاشرتی عذاب سے متعلق ہیں وہاں سامنے آجائیں گی۔

والسلام (پرویز)

---

## ۳۔ والدین کی اطاعت

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک لڑکے نے اپنی بیوی کو اس لئے قتل کردیا کہ اس نے اس لڑکے کی والدہ (یعنی اپنی ساس) کا حکم نہیں مانا تھا۔ قرآن کی رو سے اس لڑکے کا یہ فعل کیسا ہے۔ نیز یہ بھی بتائیے کہ بعض اوقات والدین اپنے لڑکوں کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کردیتے ہیں اور کبھی انھیں مجبور کردیتے ہیں کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدیں اور سعادت مند لڑکے یہ سب کچھ اسلئے کردیتے ہیں کہ ماں باپ کا حکم ماننا فرض ہے۔

**طلوعِ اسلام** ہم اس سے پہلے بھی اس امر کی وضاحت کرچکے ہیں کہ قرآن میں ماں باپ کی اطاعت کا حکم کہیں نہیں آیا۔ قرآن صرف ان سے حسنِ سلوک کی تاکید کرتا ہے چونکہ دوسرے مذاہب میں اور عام اخلاقی ضوابط میں یہ چیز چلی آتی ہے

/ کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے اس لئے مسلمانوں نے بھی اپنے ہاں اس چیز کو بطور عقیدہ داخل کر رکھا ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب تک کوئی بچہ سن شعور تک نہیں پہنچتا اسے ماں باپ کی رہنمائی کے مطابق چلنا ہوتا ہے لیکن جب وہ شعور کی عمر تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس پر کبھی یہ پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کہ وہ دوسروں کی اطاعت کو اپنے اوپر فرض قرار دے اور پھر اطاعت بھی ان بوڑھوں کی جن کے متعلق خود قرآن یہ کہتا ہے کہ عمر کے تقاضے سے ان کی عقلیں اوندھی ہو جاتی ہیں۔ اور جو کچھ انھوں نے پہلی عمر میں سیکھا ہوتا ہے اُسے بھی بھول جاتے ہیں۔ قرآن عائلی زندگی ( FAMILY LIFE ) کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سن شعور تک پہنچنے کے بعد لڑکے لڑکیاں اپنے خاندانوں سے نکل کر الگ نہیں ہو جاتے۔ وہ ان خاندانوں کا جزو رہتے ہیں اور اس طرح ان بزرگوں کے تجربوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں جوان سے عمر اور علم میں بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کے تجربے سے فائدہ اٹھانا اور بات ہے اور اس کی اطاعت کرنا اور بات ہے۔

اطاعت کے اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں عائلی زندگی کہ جس سے جنت کا سا سکون حاصل ہونا چاہیئے تھا جہنم کی شعلہ زار آگ بن کر رہ گئی ہے۔ یوں تو اس کا اثر زندگی کے اور شعبوں پر بھی کم نہیں لیکن لڑکوں کی ازدواجی زندگی کے معاملہ میں تو اس کی ہلاکت آفرینیاں انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ شادی کے وقت (لڑکی تو ایک طرف) لڑکے کو بھی بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بیوی گھر میں آتی ہے تو وہ ساس کے کچوکوں کا تختۂ مشق بنتی ہے اور اس کا میاں سب کچھ دیکھتے ہوئے ایک لفظ زبان تک بھی نہیں لاسکتا۔ کیونکہ اس سے ماں کی نافرمانبرداری کا ڈر ہوتا ہے جو سخت گناہ ہے حتیٰ کہ وہاں سے طلاق کا حکم بھی ہو جاتا ہے اور لڑکا اسی اطاعت کے جذبہ میں ایک دو تین کر دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ اگر ساری عمر اس قسم کی اطاعت کرتا رہے اور کبھی آخری وقت کسی ایک معاملہ میں بھی ان کا حکم نہ مانے تو وہ اسے ناخلف اور ناہنجار اور نہ معلوم کیا کچھ قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی گلی محلہ کے تمام بڑے بوڑھے اسے ہدف طعن و تشنیع بنا ڈالتے ہیں۔

ہم عائلی زندگی کے مسئلہ پر کچھ تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کا یہ موقعہ نہیں۔ ذرا دوسرے امور سے فرصت مل جائے تو اس اہم مسئلہ کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی جاسکے گی۔ کیا کیا جائے۔

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

---

## ۴۔ کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟

ایک صاحب لاہور سے دریافت فرماتے ہیں:۔

آیا انسان کی موت کا وقت پہلے سے ہی معین ہوتا ہے؟ ( Predestined ) یعنی اس عالم کون و فساد میں ہر متنفس کا عرصۂ حیات خدائے عزوجل کی طرف سے مقدر کر دیا گیا ہے اور اس میں کم و بیش نہیں ہو سکتا۔ یا مرگ و زیست حالات و حادثات دہر کے تابع ہوتے ہیں۔

بعض اوقات کسی مریض کے علاج میں کوتاہی ہو، مریض کا اخفائے مرض، مناسب طبی امداد کی عدم موجودگی، غلط تشخیص وغیرہ موت کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان حالات میں کیا سمجھنا چاہئے کہ متوفی کا عرصۂ حیات ہی اسی قدر تھا یا اگر اس کا مناسب علاج ہوتا تو وہ زندہ رہ سکتا تھا۔

یا مثلاً ایک شخص سات بجے صبح تندرست و توانا جہاز پر سوار ہوتا ہے اور سات بجکر ۵ امنٹ پر ہوائی حادثہ کی وجہ سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ کیا وہ جہاز پر سوار نہ ہونے سے بچ سکتا تھا۔

صلۂ رحمی، صدقات و خیرات سے عمر بڑھ سکتی ہے اور مرض الموت سے نجات مل سکتی ہے یا یہ محض توہمات ہیں۔

**طلوع اسلام** یہ سوال دراصل مسئلہ تقدیر سے متعلق ہے۔ اور تقدیر کا مسئلہ وہ ہے جس کے متعلق غلط تصور نے مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔ تقدیر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس کے متعلق ہر دور میں کتابوں کے انبار لکھے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی پیچیدگیاں حل ہونے میں نہیں آئیں۔ محترم پرویز صاحب نے اپنی کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد میں اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا مطالعہ بہت سے اشکالات کو رفع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔

یہ سوال کہ انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے یا یہ گھٹ بڑھ سکتی ہے، اسی اصولی مسئلہ سے متعلق ہے کہ انسان مجبور محض ہے یا اسے اختیار و ارادہ بھی حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب باب المراسلات میں ضمنی طور پر نہیں دیا جا سکتا اس لئے ہم اس اصولی سوال کے متعلقات و تضمنات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اسی نکتہ کے متعلق کچھ صراحت کریں گے کہ انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے یا گھٹ بڑھ سکتی ہے۔

سورۂ آل عمران میں ہے کہ

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا (۳/۱۴۴)

اس کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے کہ "کسی شخص کے لئے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ موت کا مقرر وقت لکھا ہوا ہے" اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ

موت کا ایک دن معین ہے

اس لئے نہ تو انسان کی احتیاط اور تدبیر اس وقت معین کو موخر کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کی بے احتیاطی قبل از وقت موت لا سکتی ہے۔ اس عقیدہ کا اثر یہ ہے کہ لوگ عام طور پر اپنی صحت سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ بیمار ہو جاتے ہیں تو اول تو علاج ہی نہیں کرتے اور اگر علاج کرتے ہیں تو بڑی بددلی سے۔ متعدی امراض کے متعلق کبھی احتیاط نہیں برتتے اور جب بھی ان سے اس کے متعلق کہا جائے تو جواب میں کہدیتے ہیں کہ موت اور بیماری سب کچھ پہلے سے لکھی ہوئی ہے انسان کی کوئی تدبیر اس لکھے کو مٹا نہیں سکتی۔ اگر موت آنی ہے تو ہزار تدبیروں کے باوجود آکر رہے گی اور اگر اس کا وقت نہیں آیا تو انسان جسقدر بد احتیاطی چاہے کرے اسے

کوئی ٹال نہیں سکتا۔ لیکن یہ تصور قرآن کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ ہر شخص جو پیدا ہوا ہے اسے موت ضرور آئے گی لیکن اس نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ وہ موت کب آئے گی۔ اس لئے ہر شخص کی موت کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ مر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے قانون نے ہر چیز کے اثرات کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں۔ آگ کے سامنے ہاتھ رکھو تو وہ (سردی کے موسم میں) خوشگوار گرمی پہنچائے گی لیکن اگر اس کے اندر ہاتھ ڈال دو تو ہاتھ جل جائے گا۔ پانی کا ایک گلاس پیو تو وہ زندگی عطا کرے گا، لیکن جب اسی پانی میں ڈوب جاؤ تو اس سے موت واقع ہو جائے گی۔ سنکھیا کی پانچ بوندیں (طبی اصولوں کے مطابق) کھاؤ تو وہ کئی امراض کو فائدہ دیگا لیکن اگر اس کی ڈلی نگل جاؤ تو اس سے ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ یہ ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اسی طرح موت کے بھی پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (۵۶/۶۰)

ہم نے تمہارے درمیان موت کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔

یہ پیمانے ایسے قانون کے مطابق متعین ہوئے ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقامات پر کتاب مؤجل کہا ہے۔ کتاب کے معنی قانون ہیں اور مؤجل کے معنی مقرر کردہ۔ یعنی یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے کہ فلاں چیز سے ہلاکت ہوگی اور فلاں سے زندگی ملے گی۔ اس کے بعد قرآن نے کہدیا کہ یاد رکھو

لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (۲/۱۹۵)

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ [1]

اگر موت کا وقت پہلے ہی سے مقرر ہوتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہی وہ حکم ہے جس کی رو سے خودکشی جرم قرار پا جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خودکشی کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں انسان اپنا خاتمہ چند لمحوں میں کر لیتا ہے لیکن اس کی دوسری شکل وہ بھی ہے جس میں انسان آہستہ آہستہ خودکشی کرتا ہے۔ مثلاً اگر تپ دق کا مریض اپنی صحت اور بیماری کے علاج سے لاپرواہی برتتا ہے تو وہ تدریجی خودکشی کرتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

قرآن علم الطب کی کتاب نہیں کہ وہ انسانی امراض اور ان کے علاج سے بحث کرے لیکن اس کے باوجود اس نے ایسے اشارات دیدیئے ہیں جن سے توجہ اس طرف منعطف ہو جاتی ہے کہ ایسے کاموں سے اجتناب برتنا چاہیئے جن سے امراض پیدا ہوتے ہیں اور جب امراض پیدا ہوں تو ایسی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں جن سے شفا ملتی ہے۔ مثلاً اس نے ایک عام اصول بیان کیا ہے کہ کلوا واشربوا ولا تسرفوا (کھاؤ پیو لیکن اس میں زیادتی نہ کرو۔ یہ صحت کا بنیادی اصول ہے۔ دوسری طرف مثلاً شہد سے متعلق کہا ہے کہ فیہ شفاء للناس (اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے) اب ظاہر ہے کہ اگر موت اور مرض کو ایک مقررہ وقت پر

---

[1] اگرچہ یہ آیت اجتماعی موت اور حیات کے قانون سے بحث کرتی ہے لیکن انفرادی موت اور حیات بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔

آتا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی تو پرہیز اور علاج سے متعلق ان ہدایات کی ضرورت ہی کوئی نہیں تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ مرض اور موت کے لئے قانون مقرر ہیں یہ چیزیں ان ہی قوانین کے مطابق آتی ہیں اور ان ہی قوانین کے مطابق جاتی ہیں لہذا ایک خاص قانون کے مطابق عمر گھٹ جاتی ہے اور دوسرے قانون کے مطابق عمر بڑھ جاتی ہے۔ سورۂ فاطر میں اسکی تصریح موجود ہے جہاں فرمایا کہ

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (۳۵)

نہ کسی کی عمر بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر قانون کے مطابق۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قانون کے مطابق عمر لمبی ہوتی ہے اور قانون ہی کے مطابق کم ہوتی ہے۔ اور قانون یہ ہے کہ بے احتیاطی سے عمر کم ہوتی ہے اور احتیاط سے عمر بڑھ جاتی ہے۔

سطور بالا میں ہم نے "عمر گھٹنے" اور "عمر بڑھنے" کے الفاظ رواج عامہ کے مطابق استعمال کئے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے گھٹنے اور بڑھنے کے الفاظ صرف اس وقت استعمال کئے جا سکتے ہیں جب پہلے عمر کو متعین شدہ فرض کر لیا جائے۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے عمر کے متعین ہونے کا تصور ہی صحیح نہیں۔ جسم کی مشینری خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلتی ہے اور اس قانون کی خلاف ورزی سے رک جاتی ہے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے قانون کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے۔ اسی قانون کی خلاف ورزی سے یہ مشین چلنے سے رک جاتی ہے کبھی بتدریج اور کبھی یکلخت۔ اب یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ جی چاہے تو اس قانون کی خلاف ورزی سے اس چلتی گاڑی کو روک دے اور جی چاہے تو ان قوانین کی اتباع سے عمر طبعی تک پہنچ جائے۔ یاد رکھئے موت کا وقت مقرر نہیں قانون مقرر ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ صدقات و خیرات سے بیماری رفع ہو سکتی ہے اور موت ٹل سکتی ہے یا نہیں۔ تو یہ ظاہر ہے کہ جسم کی مشینری خدا کے طبعی قوانین کے مطابق چلتی ہے اسلئے اس پر غیر طبعی افعال کا براہ راست اثر نہیں ہوتا۔ البتہ صدقہ و خیرات وغیرہ، غیر طبعی افعال کا اثر مریض پر نفسیاتی طور پر ہوتا ہے اور اس نفسیاتی اثر (PSYCHOLOGICAL EFFECT) سے مریض کی قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے جس سے بیماری کے رفع ہونے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نفسیاتی اثر اس عقیدہ کے ماتحت ہوتا ہے اگر یہ عقیدہ نہ رہے تو پھر اس کا اثر بھی نہیں رہتا۔ ہمیں قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ یہ عقیدہ جھاڑ پھونک گنڈے تعویذ کے عقائد کے قبیل سے ہے جو انسان کے دور سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ قرآن ان توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے۔ وہ عقل و بصیرت اور قوانین و ضوابط سے بات کرتا ہے، نفسیاتی فریب کے الجھاؤ میں نہیں الجھتا۔

---

## عورت سے غیر فطری مجامعت

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ بعض محدثین کے نزدیک عورت سے غیر فطری مجامعت بھی جائز ہے؟ کیا کسی جگہ اس کی تصریح مل سکتی ہے یا یہ لغو بات ہے۔

**طلوعِ اسلام** | یہ بات بالکل لغو نہیں، صحیح ہے۔ بخاری کی ایک حدیث ہے جس کی شرح بیان کرتے ہوئے علامہ بدرالدین عینی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ بحث بجنسہٖ نقل کر دی جائے۔

بخاری میں ہے:۔

باب قولہ تعالیٰ نساءکم حرث لکم فأتوا حرثکم انّٰی شئتم وقدموا لانفسکم الآیہ[1]

حدثنا اسحٰق قال اخبرنا النضر بن شمیل قال اخبرنا ابن عون عن نافع قال کان ابن عمرؓ اذا قرأ القراٰن لم یتکلم حتی یفرغ منہ فاخذت علیہ یوماً فقرأ سورۃ البقرۃ حتی انتہی الی مکان قال تدری فیما انزلت قلت لا قال نزلت فی کذا وکذا ثم مضیٰ وعن عبد الصمد قال حدثنی ابی قال حدثنی ایوب عن نافع عن ابن عمر فأتوا حرثکم انی شئتم قال یاتیہا فی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رواہ محمد بن یحیٰی ابن سعید عن ابیہ عن عبید اللہ عن نافع عن ابن عمر۔ (بخاری کتاب التفسیر ج ۲ ص ۶۴۹ مطبوعہ مجتبائی۔)

حق تعالیٰ کے اس قول کا باب کہ نساءکم حرث لکم فأتوا حرثکم انّٰی شئتم وقدموا لانفسکم الآیہ

ہم سے اسحٰق نے بیان کیا کہ ہمیں نضر بن شمیل نے خبر دی کہ ہمیں ابن عون نے نافع سے خبر دی کہ ابن عمرؓ جب قرآن پڑھا کرتے تھے تو فارغ ہونے تک بولتے نہیں تھے۔ میں ایک روز قرآن کریم ہاتھ میں لیکر ان کے سامنے بیٹھا اور انھوں نے سورہ بقرہ پڑھی حتیٰ کہ کسی مقام تک پہنچے اور پوچھنے لگے "جانتے بھی ہو کس بارہ میں نازل ہوئی تھی؟" میں نے جواب دیا کہ نہیں تو ابن عمرؓ نے فرمایا "فلاں فلاں بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ پھر آگے چل دیئے۔ اور عبد الصمد سے مروی ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ مجھ سے ایوب (سختیانی) نے بیان کیا نافع سے انھوں نے ابن عمرؓ سے کہ فأتوا حرثکم انی شئتم کی تفسیر ابن عمرؓ نے بیان کی کہ اپنی بیوی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جماع کرے۔ اس کو محمد بن یحیٰی ابن سعید نے بھی بیان کیا ہے اپنے باپ سے انھوں نے عبید اللہ سے انھوں نے نافع سے انھوں نے ابن عمرؓ سے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ حدیث کے متن اور ترجمہ دونوں میں اس مقام پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیئے گئے ہیں جہاں سے اصل بات واضح ہوئی تھی۔ بخاری میں اس مقام پر جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے اور یہیں سے اس بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں:۔

یہاں اصل کتاب (بخاری) میں خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے یعنی لفظ فی کے بعد۔ حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں کہا ہے فی قُبُلِھا یعنی اپنی بیوی کی شرمگاہ میں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں

---

[1] اس آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں پس تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہے آؤ" لیکن اس کا صحیح ترجمہ ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں جب چاہو آؤ"۔

ابو قلابۃ الرقاشی سے انھوں نے عبدالصمد بن عبدالوارث سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور وہاں انھوں نے یاتیھا فی الدبر (اپنی بیوی سے دبر میں جماع کرے) کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری)

اسی ضمن میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:-

ابن العربی نے سراج المریدین میں نقل کیا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو تفسیر میں نقل کیا ہے اور کہا ہے یاتیھا فی . . . . . . . اور خالی جگہ چھوڑ دی ہے۔ اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔ اس موضوع پر محمد بن شعبان نے ایک پوری کتاب تصنیف کی ہے اور محمد بن سحنون نے ایک جزو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابن عمرؓ کی حدیث عورت سے دبر میں مجامعت کرنے ہی کے بارہ میں ہے۔ مازری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے اندر اختلاف ہے۔ جو لوگ اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں انھوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ اور جو لوگ اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں وہ یہ کہہ کر اس سے الگ ہوگئے ہیں کہ یہ آیت اس سبب کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جو جابر کی حدیث میں آرہا ہے۔ یعنی یہودیوں پر رد کرنے کیلئے جیسا کہ دوسری حدیث میں آرہا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ عموم جب کسی خاص سبب پر وارد ہوتا ہے تو بعض اصولیوں کے نزدیک وہ اسی پر محصور رہتا ہے اگرچہ اکثر اصولیوں کے نزدیک عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ یہ اصول اس بات کو مقتضی ہے کہ یہ آیت جواز میں حجت ہو لیکن بہت سی حدیثیں اس کی ممانعت کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں لہٰذا وہ حدیثیں آیت کے عموم کیلئے مخصص ہو جائیں گے۔ اگرچہ عموم آیت کی کسی خبر واحد سے تخصیص کرنے کے بارہ میں بھی علماء کے اندر اختلاف ہے اور ائمہ حدیث میں سے ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے جیسے امام بخاری، ذہلی، بزار، نسائی، اور ابو علی نیشا پوری وغیرہ کہ اس بارہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ (فتح الباری)

یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک اس مسئلہ میں علماء میں اختلاف ہے بعض اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور بعض اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں۔ اب علامہ عینی کی مزید تصریح ملاحظہ کیجئے:-

ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ اس کو بہت بڑی جماعت نے جائز کہا ہے۔ ان سب اقوال کو ابن شعبان نے اپنی کتاب "جماع النسواں" میں جمع کر دیا ہے اور اس کے جواز کو صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے اور بہت سی روایتوں سے امام مالک کی طرف بھی نسبت کی ہے۔ اور ابوبکر الجصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ امام مالکؒ سے اس کی اباحت مشہور ہے اور امام مالکؒ کے اصحاب اس کا انکار محض اس کی شناعت اور قبح کی وجہ سے کر دیتے ہیں۔ مگر امام مالکؒ کی یہ بات اسقدر مشہور ہے کہ ان لوگوں کے انکار سے اسکی نفی نہیں ہو سکتی۔

محمد بن سعد نے ابوسلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے کہ میں امام مالک بن انس کی خدمت میں حاضر تھا۔ ان سے مجامعت فی الدبر کے بارہ میں سوال کیا گیا تو انھوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا اور فرمایا کہ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آرہا ہوں۔ ایسے ہی ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے تھے۔ میں نے کسی ایسے آدمی کو

نہیں پایا جس سے دین کے بارہ میں پیروی اور اقتداء کر سکوں اور وہ اس کے حلال ہونے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت سے اس کے دبر میں جماع کرنے کے بارہ میں۔ اس کے بعد امام مالک نے یہ آیت پڑھی نساءکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم۔ امام مالک نے فرمایا کہ اس سے بڑھکر اور کونسی چیز واضح ہوگی اور میں اس میں ذرا بھی شک نہیں کرتا۔ رہا امام شافعیؒ کا مذہب اس بارہ میں، تو امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ ہم سے محمد بن الحکم نے بیان کیا کہ انھوں نے امام شافعیؒ کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور قیاس یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ (عینی)

یعنی امام مالک تو یقینی طور پر اس کے حلال ہونے کے قائل اور اس پر کاربند بھی تھے اور امام شافعی کا قیاس تھا کہ یہ حلال ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے اس باب میں امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ بھی نقل کیا ہے جو انھوں نے امام محمدؒ (شاگرد امام اعظمؒ) سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

امام حاکم نے مناقب شافعیؒ میں ابن الحکم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ مشہور ہے جو اسی مسئلہ کے بارہ میں امام شافعی اور امام محمد بن الحسن کے درمیان ہوا۔ ابن الحسنؒ نے امام شافعیؒ کے خلاف اس امر سے استدلال کیا کہ کھیتی تو فرج ہی میں ہوسکتی ہے تو امام شافعی نے جواب میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرج کے علاوہ باقی سب کچھ حرام ہے۔ امام محمد بن الحسن نے اسکو مان لیا کہ ہاں فرج کے علاوہ دوسرے مواقع حرام ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے پوچھا، مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی پنڈلیوں کے درمیان یا اس کی کہنیوں وغیرہ کے درمیان مجامعت کرے تو کیا یہاں کھیتی ہوگی؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں ان جگھوں پر کھیتی نہیں ہوگی۔ امام شافعی نے پوچھا کہ کیا یہ حرام ہوگا؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ پھر تم جس بات کے خود بھی قائل نہیں اس سے کس طرح استدلال کرتے ہو۔ امام حاکم نے کہا ہے کہ شاید امام شافعیؒ اپنے قول قدیم میں اس کے حلال ہونے کے قائل ہوں کیونکہ اپنے قول جدید میں اس کے حرام ہونے کی انھوں نے تصریح کی ہے۔ (فتح الباری)

یہ ہے وہ بحث جو اس باب میں شروح بخاری میں وارد ہوئی ہے اور جسے ہم نے بادلِ ناخواستہ نقل کیا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ باتیں سچ مچ ان بزرگوں کی ہیں جن کی طرف انھیں منسوب کیا گیا ہے تو دنیا ان کے متعلق کیا کہے گی۔ اور اگر یہ چیزیں ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں تو ان کتابوں کو کیا کیا جائے جن میں یہ مذکور چلی آتی ہیں اور جن کے متعلق ہمارے علمائے کرامؒ کا ارشاد ہے کہ ان کا علم حاصل کئے بغیر دین سمجھ میں نہیں آسکتا۔

حقیقت خرافات میں کھوگئی۔

---

# نقد و نظر

**خالد" (حیدرآباد سندھ)**
یہ ماہنامہ زیر نگرانی جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب نامی اور زیر ادارت جناب جے۔ کے قدوائی و ابن احمد صاحب حیدرآباد سندھ سے طلبار کی اصلاح کے لئے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ اور قیمت فی پرچہ چھ آنے ہے۔

ماہ دسمبر ۱۹۵۲ء اور جنوری ۱۹۵۳ء کا مشترکہ پرچہ مشتمل بر چالیس صفحات زیر نظر ہے۔ پرچہ بہ حیثیت مجموعی طلبار کے لئے مفید نظر آتا ہے۔ "آپ بیتی" از جناب عبدالغفور صاحب اور "اطاعت امیر" از جنابہ فرحت سلطانہ۔ اچھے خاصے سبق آموز مضامین ہیں۔ اور طلبا کے لئے مفید۔ ضخامت قیمت کے مقابلہ میں نسبتاً کم ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ محترم نامی صاحب کی نگرانی میں رسالہ کو بیش از بیش کار آمد اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

**"اقلیم توبہ" المعروف "قصہ گامن سچار"**
مولفہ سید اصغر علی شاہ صاحب ترمذی
ملنے کا پتہ:۔ احاطہ حسینی ریلوے روڈ۔ رحیم یار خاں۔ ریاست بھاولپور
ضخامت ۵۶ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

یہ ایک اصلاحی قصہ پرانی طرز کا ہے جو پہلی دفعہ ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا اور دوبارہ ۱۹۵۲ء میں چھپا ہے۔ ہمارے خیال میں پرائمری اور مڈل سکول کے طلبار کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

**فرہنگنامۂ جدید (فارسی، اردو، انگریزی)**
مطبوعہ ربن پریس، نبل روڈ لاہور۔ مجلد قیمت ۱۲/-
پروفیسر فیروز الدین صاحب رازی استاد ادبیات فارسی گورنمنٹ کالج شاہپور (پنجاب) کی گرانقدر تالیف ہے جس میں بیس ہزار سے زیادہ الفاظ کے معانی اردو اور فارسی میں بتلائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان عربی ترکیبات کے معنی بھی دیدیئے گئے ہیں جو فارسی زبان میں مروج ہیں۔ آخر میں ایک طویل فہرست ان الفاظ کی دی گئی ہے جو قدیم فارسی میں رائج تھے اور ان کے بالمقابل وہ جدید مرادفات بھی دیدیئے گئے ہیں جو جدید فارسی میں آج کل رائج ہیں۔

سب سے آخر میں متفرق عنوانات مثلاً "وقت و موسم وغیرہ" — "خانہ و متعلقات آں" — "اصطلاحات علمی" — "اجزاء و قسمت ہائے بدن" — "پرندگان" — "خزندگان" — "میوجات" — "اصطلاحات جغرافیائی" — "فلزات و جواہرات وغیرہ" — "اسباب سرمیز وغیرہ" — "بیماری ہا" — "وسائط نقلیہ" — "لباس" — "پیشہ وراں" —

گلہا" ۔ " حیوانات " ۔ " اصطلاحات تجارت " ۔ " ملٹری ۔ بحری ۔ فضائی وغیرہ کے متعلق ضروری الفاظ کی فہرست دیدی گئی ہے اور بالمقابل انگریزی میں ان کے مرادفات دیدیئے گئے ہیں ۔

کتاب بحیثیت مجموعی نہایت محنت عرق ریزی اور سلیقہ کے ساتھ مرتب کی گئی ہے ۔ مولف موصوف کا نام نامی ہی اس کی صحت وگرانقدری کا ضامن تھا مگر ساتھ ہی اس امر سے کتاب کے مفید و مستند ہونے میں چار چاند لگ گئے ہیں کہ مصنف موصوف کو اپنی اس ذمہ دارانہ تالیف میں آقائی رشید احمد صاحب سفیر کبیر ایران کی اعانت و مساعدت بھی حاصل رہی ہے ۔ اور علامہ سعید نفیسی آقائی احمد بہمنیار، آقائی ڈاکٹر محمد معین اور پروفیسر لطف علی صورتگر استادان دانش گاہ طہران نے اس فرہنگنامہ پر نظر ثانی فرمائی ہے ۔ کتاب کی ابتدا میں ایران کے مستند مشاہیر کی تقاریظ زینت دہ کتاب ہیں ۔ کتاب مجلد ہے اور نہایت عمدہ کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں طبع کی گئی ہے ۔ ضخامت تقریباً ۴۲۶ صفحات ۔ قیمت بارہ روپے آٹھ آنے ۔

# دیکھئے ۔ اپنا نمبر خریداری تلاش کیجئے

فروری ۱۹۵۳ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہوگیا ہے لہذا آئندہ ماہ مارچ ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا ۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ر فروری ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے ۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ر جنوری سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرمادیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا ۔

## فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہوگیا ۔

۴۷ — ۲۴۶ — ۲۵۵ — ۲۶۴ — ۳۰۸ — ۴۳۷ — ۴۳۸ — ۴۵۶ — ۴۶۴ — ۴۶۵ — ۴۶۷ —

۴۶۹ — ۴۷۴ — ۴۷۵ — ۴۷۹ — ۴۸۲ — ۴۸۸ — ۴۹۲ — ۴۹۵ — ۵۱۳ — ۶۹۴ — ۷۰۵ — ۷۳۲

۷۵۴ — ۷۵۸ — ۷۶۱ — ۷۶۷ — ۷۶۸ — ۷۷۰ — ۷۷۳ — ۷۷۴ — ۷۷۵ — ۷۷۸ — ۷۸۰ — ۷۸۱ —

۷۸۲ — ۷۸۳ — ۷۸۶ — ۷۹۰ — ۷۹۱ — ۷۹۲ — ۷۹۳ — ۷۹۴ — ۷۹۵ — ۷۹۶ — ۷۹۷ — ۷۹۸ — ۷۹۹ — ۸۰۰ —

۸۰۱ — ۸۰۲ — ۸۰۳ — ۸۰۴ — ۸۰۵ — ۸۰۶ — ۸۰۷ — ۸۰۸ — ۸۲۲ — ۸۲۳ — ۸۲۴ — ۸۲۵ — ۸۲۶ — ۸۳۱ —

۸۳۳ — ۸۴۴ — ۸۴۸ — ۱۰۷۴ — ۱۱۰۴ — ۱۱۰۵ —

# رابطۂ باہمی

جنوری ۱۹۵۳ء کے طلوعِ اسلام میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ مختلف شہروں کے قارئین طلوعِ اسلام ایک دوسرے سے تعارف اور رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں ہمیں بہت سے احباب کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ سردست تجویز یہ ہے کہ ان شہروں کے احباب جن کے نام نیچے دیئے گئے ہیں ان احباب سے ربط پیدا کریں جن کا پتہ ان شہروں کے سامنے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ احباب (جن کے نام نیچے لکھے گئے ہیں) ہمیں مطلع فرمائیں کہ ان سے کتنے احباب نے رابطہ پیدا کیا۔ ہم اس کے بعد غور کریں گے کہ اس رابطۂ باہمی کو مفید بنانے کی کیا شکل اختیار کی جائے۔ واضح رہے کہ یہ روابط قرآنی مسائل کو سمجھنے اور قرآنی فکر کو عام کرنے کی غرض سے ہوں گے اسلئے ان میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق حضرات شریک ہو سکتے ہیں۔

لاہور ـــــ ناظم دارالقرآن۔ نسبت روڈ۔ لاہور

سکھر ـــــ محبوب سردار صاحب۔ سردار انجینرنگ ورکس۔ سکھر

کوئٹہ ـــــ نقیر محمد بگٹی۔ بلوچستان سکرٹریٹ جونیر اسسٹنٹس۔ کوارٹرز ۱/۵ وائٹ روڈ۔ کوئٹہ

جہلم ـــــ راجہ انور علی صاحب۔ جنرل مرچنٹ۔ ڈنڈوت۔ جہلم

رسالپور ـــــ سارجنٹ سید باقر علیم صاحب۔ سارجنٹس میس۔ آر۔ پی۔ اے۔ ایف کالج۔ رسالپور

منٹگمری ـــــ عبدالقادر خاں صاحب۔ خان ڈسپنسری۔ جناح چوک۔ منٹگمری

پشاور ـــــ ڈاکٹر عبدالغفور قریشی صاحب۔ نمک منڈی۔ پشاور شہر

کراچی ـــــ ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

گجرات ـــــ حکیم محمد حسین صاحب۔ فیض الٰہی منزل۔ سول لائن۔ گجرات۔

تخت بھائی ـــــ شمس الوہاب صاحب ممبر مجلس نافذہ۔ مرکزی اسلام لیگ پاکستان۔ تخت بھائی۔ ضلع مردان۔ (سرحد)

راولپنڈی ـــــ ملک جمال الدین صاحب آنریری جنرل سکریٹری انجمن فیض الاسلام۔ ٹرنک بازار۔ راولپنڈی۔

سیالکوٹ ـــــ محمد سبحانی صاحب اے۔ ایس۔ او۔ بالمقابل نیو پیپل سینما۔ بالائی منزل۔ سرجن سرجیکل کمپنی۔ سیالکوٹ۔

پتوکی ضلع لاہور ـــــ عنایت اللہ صاحب سنٹر ہیڈ ماسٹر لٹھے مینس۔ ڈاکخانہ چک ۲۵ براستہ پتوکی۔ ضلع لاہور۔

# طلوع اسلام کا تازہ پرچہ

اور

# طلوع اسلام کا لٹریچر

## اپنے اپنے شہر میں ان مقامات سے طلب فرمائیے

**لاہور:** (۱) مکتبۂ جدید۔ چوک انارکلی۔ لاہور۔

(۲) گوشۂ ادب۔ چوک انارکلی۔ لاہور

(۳) حسن برادرز۔ چوک انارکلی۔ لاہور

(۴) فیروز سنز۔ مال روڈ۔ لاہور۔

(۵) زریں بک ڈپو۔ میکلوڈ روڈ۔ نزد پیلس سینما۔ لاہور

**راولپنڈی:** (۱) قومی کتب خانہ۔ چوک نیا بازار۔ راولپنڈی

(۲) اے۔ جی۔ خانصاحب۔ نیوز ایجنٹ

ٹرنک بازار۔ راولپنڈی۔

(۳) مکتبہ اخوت۔ جامعہ مسجد۔ راولپنڈی

(۴) ریلوے بک سٹال۔ راولپنڈی۔

**پشاور:** (۱) صادق کمیشن ایجنسی۔ قصہ خوانی بازار پشاور

(۲) اردو محل (رجسٹرڈ) پشاور صدر

(۳) اسٹار نیوز ایجنسی۔ بازار کلاں۔ پشاور شہر

(۴) دی لنڈن بکسٹال ۲۱ ارباب روڈ۔ پشاور چھاؤنی۔

**کوئٹہ:** (۱) علیگڈھ بکسٹال۔ مشن روڈ۔ کوئٹہ

(۲) دی نیو بکسٹال۔ سورج گنج بازار۔ کوئٹہ

(۳) ریلوے بکسٹال۔ کوئٹہ

**سرگودھا:** پاکستان اسٹنڈرڈ بک سٹال

کچہری بازار۔ سرگودھا۔

**منٹگمری:** (۱) فضل نیوز ایجنسی۔ صدر گیٹ۔ منٹگمری۔

(۲) ولایت خاں جنرل نیوز ایجنٹ۔ منٹگمری۔

(۳) ریلوے بک سٹال/ منٹگمری۔

**کیمبل پور:** (۱) الٰہی بخش اینڈ برادرز۔ نیوز ایجنٹ

سول بازار۔ کیمبل پور

(۲) ریلوے بک سٹال۔ کیمبلپور

**جہلم:** (۱) نیا مکتبہ۔ نیا بازار۔ جہلم

(۲) بٹ نیوز ایجنسی۔ نیوز ایجنٹ۔ جہلم

**ملتان:** (۱) نیا مکتبہ۔ چوک حسین آگاہی۔ ملتان۔

(۲) ریلوے بکسٹال۔ ملتان چھاؤنی۔

(۳) مخدوم منظور احمد شاہ۔ ڈاکخانہ قادر پوران۔ ضلع ملتان۔

**ڈھاکہ:** (۱) مشتاق بک سٹال۔ راجہ سری ناتھ اسٹریٹ

لال باغ۔ ڈھاکہ

(۲) خلیق احمد اینڈ سنز۔ ۱۹۱ چوک سرکلر روڈ۔

ڈھاکہ

**شیخوپورہ:** پاکستان کتاب گھر۔
اکبر بازار شیخوپورہ

**ڈیرہ اسماعیل خاں** - راجہ برادرز بک سیلرز
ڈیرہ اسمٰعیل خاں

**کوہاٹ:** - مفید عام بک سٹال
متصل کچہری دروازہ - کوہاٹ

**مردان:** ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب - بر دکان ڈاکٹر
نواب علی انور علی کیمسٹ - بنک روڈ مردان۔

**حیدرآباد سندھ:** (۱) آزاد بک ڈپو
صدر بازار - حیدرآباد سندھ
(۲) ریلوے بک سٹال - حیدرآباد سندھ

**حسن ابدال:** مغل اسٹورز، نیوز ایجنٹ
حسن ابدال

**نوشہرہ:** دی ایمپائر بکڈپو بک سیلرز اینڈ نیوز ایجنٹس
چرچ روڈ - نوشہرہ

**جھنگ مگھیانہ:** شیخ محمد حسین صاحب تاجر کتب و
نیوز ایجنٹ - جھنگ مگھیانہ

**مظفر گڈھ:** عبدالکریم صاحب نیوز ایجنٹ
مظفر گڈھ

**بنوں:** گل نصیب صاحب نیوز ایجنٹ
رابرٹ روڈ - نبی بخش بلڈنگ - بنوں۔

**ڈیرہ غازی خاں:** اللہ بخش خاں صاحب نیوز ایجنٹ
ڈیرہ غازی خاں۔

**اوکاڑہ:** زبیر عزیز صاحب پاکستان نیشنل اسٹور
اوکاڑہ - ضلع منٹگمری۔

**میرپور خاص:** رفیق احمد بشیر احمد دہلوی ایجنٹ اخبارات
غریب آباد - میرپور خاص سندھ

**گجرات:** عنایت رسول مسلم نیوز ایجنسی - جلال پور جٹاں - گجرات

**سیالکوٹ:** ملک اینڈ سنز نیوز ایجنٹس - سیالکوٹ شہر

**لائلپور:** (۱) نہال بک سٹال - پنجاب گورنمنٹ ٹرانسپورٹ لائلپور
(۲) ریلوے بک سٹال - لائلپور

**گوجرانوالہ:** بشیر صحرائی امرتسری ایجنٹ اخبارات
۳ - ریل بازار - گوجرانوالہ

**حافظ آباد:** اکبر علی چوہان ایجنٹ اخبارات
حافظ آباد - ضلع گوجرانوالہ

**لاڑکانہ:** (۱) علی حسن صاحب [illegible] ہسپتال - ایمپائر ٹاکیز - لاڑکانہ
(۲) ظہور محمد اینڈ برادرز ریلوے بک سٹال - لاڑکانہ

**پشین:** سید شبیر احمد جمیل احمد نیوز [illegible]ٹ - پشین - (بلوچستان)

**بھڈانہ شریف:** عزیز فا[illegible] صاحب بھڈانہ شریف
تحصیل گوجر خان - ضلع راولپنڈی۔

**بدین:** مولوی عبداللہ صاحب نیوز ایجنٹ
شہر بدین - ضلع حیدرآباد سندھ

**ایبٹ آباد:** شیخ محمد حنیف ایکس کونٹریٹ بکڈپو - ایبٹ آباد

**روہڑی:** ریلوے بکسٹال روہڑی جنکشن

**کوٹری:** ریلوے بکسٹال کوٹری جنکشن

**خانپور:** ریلوے بکسٹال خانپور جنکشن

**رنگون برما:** منشی فتح محمد اعظمی صاحب ۲۴۴-۲۴۲-۴۹ سٹریٹ
پوسٹ بکس ۱۳۲۲ رنگون - (برما)

**بحرین:** رحیم بخش صاحب معرفت پوسٹماسٹر بحرین
پرشین گلف

# تعمیرِ نشیمن

کیا غضب ہے کہ بہار اپنی ہو گلشن اپنا
اپنے پھولوں سے بھریں پھر بھی نہ دامن اپنا

دانے دانے کے لئے ہاتھ جو پھیلایا ہے
کون سی برق سے غارت ہوا خرمن اپنا

دل نے جذبات کے طوفاں میں پھنسایا ہم کو
سچ تو یہ ہے کہ یہی دوست ہے دشمن اپنا

شہسواری کا ہمیں شوق مبارک لیکن
کہیں قابو سے تو باہر نہیں توسن اپنا

اپنی رفتار میں پہلی سی وہ تیزی نہ رہی
کہیں منزل کا تصور نہ ہو رہزن اپنا

اس قدر اُنس قفس سے ہے کہ ہو کر آزاد
اُسی ہیئت پہ بناتے ہیں نشیمن اپنا

شک ہے شاید ہمیں کچھ اپنی ہی دینداری میں
دشمنِ دیں کو جو سمجھے نہیں دشمن اپنا

حرمِ دیں میں بھی انداز ہے بت خانے کا
خواہشِ دل ہے صنم، شیخ برہمن اپنا

یوں تو دُنیا میں مسلماں کا کوئی دوست نہیں
لیکن افسوس کہ یہ خود بھی ہے دشمن اپنا

اسد ملتانی